فقہ واجتہاد

حافظ ثناء اللہ مدنی

پارلیمنٹ کی رکنیت اور سرکاری عہدے!!

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج بخیر!

پاکستان کی سیاست اور اس کے خود ساختہ دستور اور جمہوری نظام کے پروردہ پارلیمانی اداروں کے حوالے سے جماعتی احوال سے آپ بخوبی آگاہ ہیں، موجودہ صورت حال میں جماعت کے بعض بزرگ سیاست میں حصہ لینے اور پارلیمانی اداروں میں پہنچ کر صدائے حق بلند کرنے کو دینی فریضہ تصور کرتے ہیں اور بعض دوسرے احباب اسے کفر سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف بڑے شدومد سے اپنی آواز بلند کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں شیخ عبدالرحمن عبدالخالق کی کتاب **مشروعیۃ الدخول فی المجالس التشریعیۃ** اور چند دیگر علماء کرام کے فتاویٰ پیش خدمت ہیں، ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ان کا مطالعہ فرمائیں گے اور ہمیں اپنے موقف کے متعلق آگاہ کریں گے کہ کیا:

۱- پارلیمنٹ کی رکنیت اور موجودہ جمہوری نظام کے ماتحت کسی سرکاری عہدے کو قبول کیا جاسکتا ہے؟

۲- رکنیت پارلیمنٹ اور عام سرکاری عہدے جب دونوں ایک ہی نظام کے ماتحت ہوں تو ان میں فرق کرنا اور پہلے کو کفر اور دوسرے کو جائز تصور کرنا کیسا ہے؟

۳- مروجہ سیاسی نظام کے تحت اگر انتخابات کرائے جائیں تو کیا ووٹ ڈالا جاسکتا ہے؟

۴- جو حضرات انتخابات میں حصہ لینے اور ووٹ ڈالنے کو کفر گردانتے ہیں، ان کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

۵- موجودہ صورت حال میں بعض احباب **اخف الضررین** کو ووٹ دینا درست سمجھتے ہیں اور بعض دوسرے اسے بھی کفر کا نام دیتے ہیں، تو کیا **اخف الضررین** یا **اھون البلیتین** کو قبول کرنے کا کوئی تصور شرعاً موجود ہے؟ خاص طور پر ایسے حالات میں کہ جب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ ہو اور اسے وقتی طور پر چند شرعی مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے قبول کرلیا جائے؟

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے قیمتی اوقات کا کچھ حصہ ان سوالات کے جوابات کے لئے صرف کریں گے۔ جزاکم اللہ خیرا ـــــ نیز یہ بھی بتائیے کہ اگر شیخ عبدالرحمٰن (جو کویت کے چند کبار علماء سے ہیں) کی کتاب کا ترجمہ (جو تیار کرلیا گیا ہے) اردو میں چھپوا دیا جائے تو کیا مفید ثابت ہوگا؟ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ شکریہ!

عارف جاوید محمدی، گوجرانوالہ

اسلام کے سیاسی نظام کے حوالہ سے ہمیں پیش آنے والے اہم مسائل کے بارے میں آپ کے سوالات کے جواب دینے سے پہلے چند تمہیدی باتیں قابل توجہ ہیں۔ کیونکہ آپ نے بلا دریغ انتخابات میں حصہ لینے والوں اور ان کے بالمقابل شدید مخالفین کا جس طرح ذکر کیا ہے، دونوں جانب افراط و تفریط موجود ہے۔ اس وقت عام مسلمان ملکی سیاست و معیشت کے میدان میں تقریباً کلی طور پر اور معاشرتی سطح پر ذرائع ابلاغ کے اثر سے کافی حد تک کفار کے وضع کردہ نظام تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ ایسی صورت میں نہ تو بلند بانگ سیاسی نعرے اور جہادی جذبہ ہماری مشکلات کا فوری حل ہے اور نہ موہوم امیدوں کے سہارے ایسے لادین نظاموں میں تحفظات کے بغیر شمولیت و تعاون کہ "ہرچہ در کاں نمک رفت، نمک شد" والا معاملہ ہوجائے۔

یہ امر بھی واضح رہے کہ جب دین "اجنبی" بن جائے تو صرف فتوؤں سے کام نہیں چلا کرتا بلکہ بصیرت کے ساتھ دعوت و تبلیغ اور حکیمانہ جدوجہد ہی مفید ہوسکتی ہے۔ چونکہ آپ نے شریعت کی روشنی میں ہی مسائل کا جواب طلب کیا ہے، اس لئے ہم بھی زیادہ تر شرعی دلائل پر ہی اکتفاء کریں گے ورنہ ایسے سوالات جب پیدا ہوتے ہیں تو ان کے حسن و قبح کا صحیح ادراک بھی انہیں لوگوں کو ہوتا ہے جو عرصہ سے ایسے معاشروں میں عملی تجربے دیکھ رہے ہیں۔ وسیع تر سطح پر اگر جائزہ لیا جائے تو علمی اختلاف حقیقتاً دین اور سیکولرزم کا ہے لیکن ایسے نظاموں سے ہمارا معاملہ زیادہ تر تدبیر و مصلحت کا ہوتا ہے جس کے بارے میں اصول و ضوابط کی حد تک تو اسلام نے بھرپور رہنمائی دی ہے لیکن تدابیر کا میدان مصالح دینیہ کے تابع رکھ کر کافی وسیع کردیا ہے۔ غزو فکری ہو یا اصلاح و انقلاب کا جہاد دونوں میدانوں میں علمی گفتگو ان لوگوں سے مفید ہوتی ہے جو شریعت کے مقاصد و وسائل اور حیلہ و تدبیر کے درمیان فرق و امتیاز ملحوظ رکھ سکیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ مذکورہ بالا نظاموں کے بارے میں اساسی گفتگو کریں تو جذباتی نوجوان تو بے پر کی لے اڑتے ہیں اور تدبیر و حکمت کی بات کریں تو اباحیت کا دروازہ کھولنے والے آلپکتے ہیں۔ بہرصورت ان دو انتہاؤں کے درمیان پہلے تمہیدی گذارشات

ملاحظہ فرمائیں پھر انہی کی روشنی میں اپنے سوالات کے جوابات پڑھ لیں:

(ا) اسلام زندگی کا کامل دستور العمل ہے، اس لئے اس میں دین و دولت (مذہب و سیاست) کی کوئی تقسیم نہیں۔ چنانچہ اسلام نے جہاں عبادات و معاملات کی تفصیلات پیش کی ہیں، وہاں سیاست کے اصول و ضوابط بھی واضح کردیئے ہیں۔ جس کی رو سے مروجہ وضعی نظام ہائے سیاست بشمول جمہوریت کی بنیادیں اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ نظام غیر شرعی ہیں، اس لئے مسلمانوں کے ہاں تو یہ بحث ہی فضول ہے کہ ان نظاموں کا کتنا حصہ اسلامی ہے اور کتنا غیر اسلامی۔ کیونکہ جب بنیاد غیر اسلامی ہو تو جزئیات کے بارے میں ایسی بحث کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوے کو مور کے پر لگانے سے کوا مور نہیں بن جاتا۔

البتہ یہ بات بعض دانشوران ملت کے حق میں ضرور قابل معذرت ہے کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد جب اکثر مسلمان ملکوں میں غیر مسلم سامراجی حکومتیں قائم ہوگئیں اور مسلمانوں کو صرف اپنی پرائیویٹ زندگی کی حد تک عبادات وغیرہ میں عمل کی گنجائش باقی رہ گئی تو سیاسی آزادی کے لئے تحریکوں میں شامل مسلمانوں کے بعض قائدین نے اس تصور کو غلط قرار دینے کے لئے کہ اسلام صرف پرائیویٹ زندگی والا مذہب ہے، ایسے نعرے بھی لگائے جن سے یہ ظاہر ہو کہ اسلام سیاست اور معیشت کو بھی شامل ہے چونکہ حالات ایسے درپیش تھے کہ سیاسی طور پر اگر جمہوریت کے نعرے پسند کئے جارہے تھے تو معاشی میدانوں میں اشتراکیت کے۔ لہٰذا ان دانشوروں نے اسلامی سیاست و معیشت کو مقبول بنانے کے لئے دیمقراطیۃ الاسلام (اسلامی جمہوریت) اور اشتراکیۃ الاسلام (اسلامی اشتراکیت) کی اصطلاحیں بھی استعمال کیں۔ اگرچہ مذکورہ بالا پیش کردہ انداز کو ایک معذرت ہی قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اب ان اصطلاحوں کے بڑے گہرے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اب ہمارے نزدیک ایسی اصطلاحات کا استعمال فائدہ کی بجائے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس لئے ان سے شدید پرہیز کرنا چاہیے۔

(ب) اسلام امن وسلامتی کا دین ہے۔ اس نے شرک جیسے نازک مسئلے پر بھی دعوتی انداز اختیار کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تیرہ سالہ قیام کے دوران اپنے ساتھیوں پر ظلم ہوتے دیکھے، اسی کعبہ (بیت اللہ) میں تیرہ سال سجدے کئے، جہاں مشرکین نے ۳۶۰ بت سجا رکھے تھے۔ حالانکہ آپ کے پاس ایسے فدائیین موجود تھے جو شہادت کو سرمایہ افتخار سمجھتے اور ان چیزوں کا پل بھر میں خاتمہ کرسکتے تھے لیکن اسلام پہلے حجت قائم کرتا ہے۔ پھر کوئی انتہائی قدم اٹھاتا ہے۔ قتل و قتال کا رویہ تو انتہائی مجبوری کی صورت قابل عمل ہے لہٰذا تشدد کی علم بردار موجودہ جہادی تحریکیں اسلامی

طریقہ کار سے ناواقفیت کی بنا پر حکومتوں کے ظلم کے رد عمل میں جو رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں، ان کی حمایت کلی طور پر بلا سوچے سمجھے نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کا طرز عمل اور آپؐ کے پیشرو دیگر انبیاء بالخصوص حضرت یوسف علیہ السلام کا برتاؤ اس امر پر دلیل ہے کہ غیر اسلامی (کافرانہ اور ظالمانہ) نظاموں کی موجودگی میں خیر کے لئے کس صبر و حوصلہ سے حکیمانہ جدوجہد کرنی چاہئے۔ یوسف علیہ السلام کی پوری زندگی دین کے لئے محنت کرتے ہوئے (اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے باوصف) گزر گئی لیکن وہ اپنے زیر نگیں علاقے میں بھی پوری طرح دین و شریعت کا نفاذ نہ کرسکے جس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ سے کیا:

﴿ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا ﴾ (المومن:۳۴)

"قبل ازیں تمہارے پاس حضرت یوسفؑ بھی معجزات لے کر آئے تھے لیکن ان کے جیتے جی ان کے پیغام کے بارے میں تم شک میں رہے پھر جب ان کا انتقال ہوگیا تو تم نے انہیں خاتم الرسل بنادیا"

آیت مذکورہ بالا میں واضح دلائل کے باوجود لوگوں کا شک میں رہنا پھر یوسف علیہ السلام کو خاتم الرسل بنا دینا قابل غور ہے۔ ایسا ہی معاملہ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے والے حبشہ کے حاکم اصحمہ نجاشی کو پیش آیا جو مسلمان ہوکر مسلمانوں کی حمایت تو کرتا رہا لیکن اپنے ماتحت رعایا کو مسلمان بنا سکا، نہ ان پر اسلام کا نفاذ کرسکا۔ حتیٰ کہ اس کی موت پر نماز جنازہ پڑھنے والے بھی موجود نہ تھے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ کا خصوصی غائبانہ اہتمام فرمایا۔

دور حاضر میں حکومتوں کے اختیارات صرف انتظامی نہیں رہے بلکہ حکومتیں اقتدار کے سرچشموں پر کنٹرول کرکے کافی حد تک فرد و معاشرہ کو بے بس بنا دیتی ہے اور بہت محدود پیمانہ پر ہی تبلیغی اثرات حاصل ہوتے ہیں۔ بے لاگ تجزیہ سے یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ واقعتاً جمہوریت بھی استبدادی نظام ہے۔ ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں:

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے آزادی کی ہے یہ نیلم پری

گویا آج کل جس طرح حکومتیں عوام کے اجتماعی معاملات پر تسلط جمائی بیٹھی ہیں اور وسیع ذرائع ابلاغ بھی رکھتی ہیں اور عسکری قوتوں کی حامل ہیں، ان سے حربی تصادم خود اور دیگر مسلمانوں کو خطرناک حالات سے دو چار کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے سلامتی کی راہ صرف یہی رہ گئی ہے کہ مروجہ نظام کے تحت ہی حتیٰ المقدور تگ ودو کی جائے۔ اس تگ ودو کے لئے انبیاء کی شرک اور دیگر

معاشرتی خرابیوں کے خلاف کافرانہ معاشروں میں جدوجہد مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ انبیاء نے اصولی طور پر معاشرے میں کشمکش اور تصادم کی دعوت نہیں دی بلکہ دعوت کے مقابلہ میں ظلم و ستم کا جواب بھی اخلاق کریمانہ اور بلند کرداری سے دیا ہے اور یہی ان کی کامیابی تھی۔

(ج) شریعت نے ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی طاقت کے مطابق جدوجہد کا مکلف بنایا ہے۔ انجام رب العالمین کے ہاتھ میں ہے، تاہم تدبیر بھی تقدیر کے تحت روا رکھی گئی ہے۔ جو ہر مکلف کو اختیار کرنی چاہئے۔ زندگی کے متنوع شعبے ہیں اور انسانوں کی صلاحیتوں کا تفاوت بھی موجود ہے تمام لوگوں کو ایک ہی کام پر نہیں ڈالا جاسکتا، تاہم مسلمانوں کی تمام کوششیں باہمی مربوط ہونی چاہئیں تاکہ نتیجتاً خیر کے لئے معاون بن سکیں۔

تعلیم و تعلم، دعوت و ارشاد اور حکمت و سیاست کے لئے اسلامی طریقہ کار ہر قسم کے حالات کے لئے موجود ہے۔ اسے کتاب و سنت اور ائمہ سلف کی زندگیوں کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ کتاب و سنت کی تعلیمات کے سمجھنے میں عموماً یہ مغالطہ پیش آتا ہے کہ کسی جزوی ہدایت کا پیش آمدہ مسئلہ سے تعلق کیا ہے؟ اجتہادی امور میں اسلامی تعلیمات کا مناسب محل میں استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں ﴿ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد "من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین" میں کیا گیا ہے۔ ہمیں جس طرح کے حالات درپیش ہیں، مسلمانوں کو اس سے پہلے بارہا پیش آچکے ہیں۔ اس سلسلے میں تاتاریوں کے غلبہ کے وقت مسلم حکمرانوں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ یہ حکومتیں ظالمانہ بھی تھیں اور اپنے طرز عمل میں اسلام کی پوری پابندی بھی نہ کرتی تھیں تاہم ان غلط امور میں قائدین اسلام ان سے بغاوت کئے بغیر ان کی اصلاح کے لئے کوشاں رہے اور خیر کے کاموں میں ان کے معاون بھی بنے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ کی مثال اس سلسلہ میں نمایاں ہے جنہوں نے ان حکمرانوں اور معاشروں کی دعوت و اصلاح کے ساتھ ساتھ خیر کے کاموں میں عملاً تعاون بھی کیا اور اپنے طرز عمل کی وضاحت بھی موقعہ بہ موقعہ کرتے رہے اس سلسلے میں مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ جلد ۲۰ صفحہ ۵۵،۵۶،۵۷ اور جلد ۳۰ صفحہ ۳۵۶ تا ۳۶۰ ان کا موقف سمجھنے کے لئے مفید ہوسکتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ مسلمان حکومتوں کا دستور ادنیٰ حد تک ان حکمرانوں کے تحت زندگی بسر کرنے کی گنجائش دیتا ہو اور ہجرت لازمی نہ ہوگئی ہو تو پھر رویہ یہی اختیار کرنا چاہئے کہ خیر کے لئے کوشش جاری رہے اور شر کے بالمقابل صبر و استقلال کے ساتھ اصلاحی جدوجہد بھی ماند نہ پڑنے پائے۔

ان تمہیدی نکات کے بعد اب ہم براہ راست سوالات کے جوابات پیش کرتے ہیں:

سوال (۱) کا جواب: جن ممالک کے دساتیر میں شریعت کی بالادستی کا دعویٰ موجود ہو وہاں پارلیمنٹ کی رکنیت اور مروجہ نظام کے ماتحت سرکاری عہدہ اس غرض سے قبول کرلینے میں کوئی حرج نہیں کہ خیر کی طرف کوئی قدم بڑھایا جاسکے تاہم یہ واضح رہے کہ اس صورت میں اول اپنی شخصیت کا ناقدانہ جائزہ اور محاسبہ پیش نظر رہے کیونکہ مصلحت کا تقاضا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض لوگ اثر انداز ہونے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں جبکہ بعض دوسرے اثر پذیر ہونے کی۔ بہرصورت مقصد امر بالمعروف و نہی عن المنکر رہے تو ٹھیک ورنہ طلب اقتدار (فرمان رسول ﷺ کے مطابق) اللہ تعالیٰ کی مدد سے محرومی کا باعث ہونے کی وجہ سے بے برکتی پر منتج ہوتا ہے۔ دوسری بات مروجہ نظاموں کے اعتبار سے یہ ہے کہ ان تمام وضعی نظاموں کی اساس حصول اقتدار ہے اور ان نظاموں کے تانے بانے اسی جال کے لئے بنے گئے ہیں۔ اس لئے جب تک خیر کے رستے کھلے پائے، کار اصلاح میں شریک رہے۔ ورنہ خود کو فتنہ سے بچانے کی راہ اختیار کرے۔

سوال (۲) کا جواب: پارلیمنٹ کی رکنیت اور دیگر سرکاری عہدوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ پارلیمنٹ کا زیادہ تر تعلق تشکیل حکومت سے ہوتا ہے تو سرکاری عہدوں کا حکومت کے ساتھ تعاون سے۔ بعض اعتبار سے پارلیمنٹ کی رکنیت زیادہ اہمیت رکھتی ہے تو دوسرے اعتبارات سے کوئی سرکاری عہدہ۔ بہرصورت اس کا تعلق اشخاص کی صلاحیت اور مواقع کی مناسبت سے ہے اور اس کا فیصلہ اسی چیز کے مدنظر ہونا چاہئے۔ کافرانہ یا ظالمانہ نظام میں شرکت یا تعاون دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اصل مقصد خیر اور اس کے حصول کے مواقع کی اہمیت ہے۔ اسلام میں وسائل مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شرعی مقصد کے لئے حیلے کا جواز اور غیر شرعی مقصد کے لئے حیلوں کی مذمت کا مطالعہ مفید ہوگا۔

سوال (۳) کا جواب: مصالح دینیہ کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی میں قریب ترین پارٹی یا اشخاص کو ووٹ ڈالنا مناسب سمجھتے ہیں لیکن اس شعور کے ساتھ کہ ووٹ اور بیعت کا آپس میں کوئی تعلق نہیں جیسا کہ ہم تمہیدی نکات میں یہ واضح کرچکے ہیں کہ لادینی نظاموں کی بعض جزئیات کو اسلامی شعارات کے مماثل قرار دینا کج فہمی ہے جو لوگ ووٹ کو بیعت پر قیاس کرنے کی جرات کرتے ہیں یا جمہوریت کو اسلامی شوریٰ پر۔ وہ اسلامی سیاست سے نابلد ہیں۔ تاہم ہماری گذارشات کے مطابق ووٹ ڈالنا ہو یا امیدواری کا مسئلہ، اس کا اصل تعلق اسلام کے لئے جدوجہد کرنے سے ہے لیکن یہ بھی واضح رہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ لادینی نظاموں

کے ذریعے نفاذ شریعت کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ ایسے اداروں میں شامل ہو کر زیادہ سے زیادہ برائی کے خلاف دفاع کیا جاسکتا ہے یا خیر کے کچھ رستے تلاش کئے یا کھولے جاسکتے ہیں۔

البتہ انتخابات کے سلسلے میں ایک بات کا تعلق زیادہ تر تجربہ سے ہے جو گذشتہ تقریباً پچاس سال سے ہم پاکستان میں دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ جمہوری انتخابات میں ووٹ سے آگے بڑھ کر امیدواری اور کامیابی کے لئے دیگر سیاسی جماعتوں سے مقابلہ اور گٹھ جوڑ کے لئے مروجہ سیاسی ہتھکنڈوں کے حوالے سے جو شخص سیاسی فریب اور جھوٹ کو اختیار نہ کرے، اس کا اقتدار میں آنا مشکل ہوتا ہے۔ اتفاقات کی بات چھوڑیئے، عام حالات میں اگر وہ مکار منافقانہ ہتھکنڈے اس مکیاولی سیاست میں استعمال نہ ہوں تو یا ناکامی مقدر بنتا ہے یا پھر کامیاب ہونے والا "شو پیس" بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں مقصد خیر کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کرنے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اگر اس کا دروازہ چوپٹ کھول دیا جائے تو پھر تقویٰ و دین کا اللہ ہی حافظ ہے!! لہٰذا ہمارے نزدیک اس میدان میں اترنے کی مشروط اجازت دفاع دین کے لئے اسی قدر ہے جتنی جہاد و قتال میں فریب کی ہو سکتی ہے، اس لئے ہم انتخابات میں شرکت کی گنجائش، نفاذ شریعت کا موثر ذریعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ شر میں کمی کی غرض سے دینی دفاع کے ایک حربہ کے طور پر ہی پاتے ہیں۔ کیونکہ جمہوری انتخابات میں بالفرض کامیاب ہو کر زیادہ سے زیادہ چہرے بدلے جاسکتے ہیں، نظام میں تبدیلی مشکل ہوتی ہے۔ پھر مکیاولی سیاست تو ایک کاروبار ہے۔ اس میں جو لوگ آتے ہیں وہ زیادہ تر نودولتیے، جاگیردار اور ایسے صنعت کار ہوتے ہیں، جن کے پاس سیاست بازی کے لئے اوقات فارغ ہوتے ہیں۔ وہ اقتدار کے لئے غلط طریقوں سے حاصل کردہ دولت کا بے دریغ استعمال کرکے کرسی پر براجمان ہوتے ہیں پھر اقتدار کا حصہ بنتے ہی وہ جوع الکلب (کتے سے منسوب حرص کی بیماری) کی صورت وہ لوٹ مار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہ سیاست تو ایک کاروبار ہے۔ دوسرے پیشوں کی طرح اس کے لئے خاندان مخصوص ہوتے ہیں۔ ایک ہی خاندان کے افراد مختلف جماعتوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اگر مخصوص جماعت اقتدار میں آئی تو فلاں فرد کے ذریعہ سیاسی فائدہ اٹھائیں گے اور اگر دوسری جماعت کامیاب ہوگئی تو دوسرا فرد خاندانی مفادات کے لئے کام آئے گا۔ یہ کھیل اتنا گھناؤنا ہے کہ اس کی کوئی سنجیدہ قوم متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہاں اس کی طرف اشارہ ہی کافی ہے۔ ایسے حالات میں بہت کم اللہ کے بندے نیک نیت رہ کر اپنی سیرت و کردار کا تحفظ کرسکتے ہیں۔ لیکن ایسے معاشرے اور نظام کے زیر نگیں رہ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلینا بھی کوئی نجات کی راہ نہیں ہے کیونکہ اس

طرح اقتدار کے سرچشموں پر صرف گندے لوگ ہی قابض ہو کر نیکی کی راہیں زیادہ سے زیادہ مسدود کرتے چلے جائیں گے اور سارا معاشرہ انہی کے رحم و کرم پر رہ جائے گا۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی شخص ہجرت کے مواقع نہ پائے اور دعوت دین یا دفاع دین کی مساعی میں شریک و معاون بھی نہ ہو تو یہ بھی بے کاری کی ایک شکل ہے بہرصورت مسلمان کو تادم حیات معاشرے کا عضو معطل بن کر رہنے کے بجائے کسی نہ کسی حد تک اصلاح میں اپنا حصہ ضرور ڈالنا چاہئے خواہ جتنا حضرت ابراہیمؑ کی چتا پر پرندوں نے چونچوں سے پانی کے قطرے گرا کر لیا تھا۔ (اسی چتا پر گرگٹ یا چھپکلی کے پھونک مارنے کی سرشت ہی کی بنا پر اس کا قتل باعث اجر و ثواب ٹھہرا۔)

سوال (۴) کا جواب: جمہوری انتخابات میں حصہ لینے کی بنا پر کفر کا فتویٰ لگانا مناسب نہیں کیونکہ کسی نظام کے کلی یا جزوی طور پر کافرانہ یا لادین ہونے کی بنا پر ہمارا طرز عمل صرف ہجرت کا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اصل کام جدوجہد ہے۔ جس طرح رسول کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تیرہ سال جدوجہد کی ہے۔ ہجرت کی اجازت تو آپؐ کو انتہائی مجبوری کی حالت میں ملی پھر ہجرت کوئی فرار نہیں بلکہ اصلاح کا ایک متبادل طریقہ کار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے کے بعد دوبارہ مکہ مکرمہ فتح کیا ہے۔

سوال (۵) کا جواب: اخف الضررین (اهون البلیتین) کے فقہی قواعد کا استعمال عموماً ان کی حیثیت جانے بغیر عام لوگ کرتے ہیں حالانکہ اصول فقہ اور فقہی قواعد کی اصطلاح میں بڑا فرق ہے۔ اصول فقہ کتاب و سنت سے مسائل کے استنباط کے لئے اجتہادی اصول ہیں تو قواعد فقہیہ استنباط مسائل کے وقت اجتہادی رویوں کو متوازن رکھنے کے کام آتے ہیں۔ اهون البلیتین کوئی اصول فقہ (اجتہاد) میں سے نہیں بلکہ ایک فقہی قاعدہ ہے۔ بہرصورت اس قاعدہ کی رو سے مصالح اور مفاسد کا باہمی تقابل کرکے مصلحت کو ترجیح دینا اور مفسدہ سے بچنا درست ہے۔ جب دین دار یا اسلام پسندوں کا مقابلہ دین بیزار یا سیکولر لوگوں سے ہو تو اس وقت ووٹ نہ دینا صرف ووٹ کا ضیاع نہیں ہوتا بلکہ بالواسطہ بے دین لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ کیونکہ مروجہ جمہوری انتخابات میں اصل معیار ووٹوں کی حقیقی کثرت نہیں بلکہ مقابلہ میں ووٹوں کی اکثریت ہے۔ لہٰذا نسبتاً بھلے آدمی کو ووٹ نہ دینا اسے مقابلہ میں کم تر بنانے کا باعث ہوتا ہے۔ نتیجتاً برے لوگ اقتدار کے سرچشموں پر فائز ہو کر خیر کے رستے بالکل بند کر دیتے ہیں۔ یہ پہلو اگر نظر میں رہے تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ روم کی ابتداء میں روم (اہل کتاب عیسائی) اور فارس (مشرک) کی جنگ میں مسلمانوں کو پہلے روم (عیسائیوں) کی شکست پر رنجیدہ ہونے کی

بنا پر اس طرح تسلی دی گئی ہے کہ چند ہی سالوں میں رومی (عیسائی) فارس (مجوسیوں) پر غالب آئیں گے۔ ﴿ ويومئذ يفرح المومنون ﴾ "اس دن مومن خوشی منائیں گے"

حالانکہ عیسائی اور مجوسی دونوں کافر ہیں لیکن مشرکین کے بالمقابل اہل کتاب اسلام کے زیادہ قریب ہیں اس لئے مسلمانوں کو نہ صرف اہل کتاب کی فتح کی بشارت دی گئی بلکہ ان کا خوشی منانا بھی پسندیدہ قرار پایا۔

نوٹ: زیر نظر سوال و جواب کے بارے میں یہ گذارش مناسب ہے کہ ایسے معاملات کا تعلق اسلام اور مسلمانوں کے مصالح اور مفاسد سے ہے اور ایسے معاملات میں جو رویے اختیار کئے جاتے ہیں وہ بھی تدبیر کی قسم سے ہیں۔ ان کے بارے میں کفر و شرک کا فتوئ تشدد اور انتہا پسندی ہے۔ البتہ مکرر یہ بات واضح رہے کہ وضعی نظام ہائے سیاست کا اسلام سے پیوند لگانا قطعاً درست رویہ نہیں۔ مسلمانوں کے اندر غزو فکری کے طور پر ان نظاموں کی خرابیوں کو واضح کرنا اور اسلامی نظام کی خوبیاں اجاگر کرنا بڑا ضروری ہے۔ بالخصوص تقابلی مطالعہ کے وقت وہ فرق ضرور ملحوظ رکھنے چاہئیں جن کی بنا پر لادین نظاموں کی بعض جزئیات کے لئے اسلامی نظام کی بعض جزئیات سے تشابہ کا مغالطہ دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

آج ہمیں یہ چیلنج درپیش ہے کہ اسلامی اصول و ضوابط کے مطابق دور حاضر کے لئے اسلام کا قابل عمل سیاسی نظام دنیا کے سامنے پیش کریں اور جب تک کوئی ایسی صورت حاصل نہیں ہوتی ایسی بحثوں کی اشاعت مفید ہے جو کتاب و سنت کی روشنی میں ہمارے تدبیری معاملات میں رہنمائی کر سکیں۔ شیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق کی محولہ بالا کتاب جو اگرچہ زیر بحث موضوع پر جامع تبصرہ کی حامل نہیں بلکہ مروجہ لادینی نظاموں میں اشتراک کی پرزور حمایت کا ایک رخ ہی ہے تاہم ایسی مباحث کا بہ دلائل مطالعہ غور و فکر کی راہیں ضرور کھولتا ہے اس طرح معاشرہ میں باشعور طرز عمل اختیار کیا جاسکتا ہے ہماری رائے میں یہ کتاب جس طرح عربی میں شائع ہوئی ہے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہونا چاہئے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ کویت کا جمہوری دور ابھی جمہوریت کے تجربہ سے اتنا آشنا نہیں جتنا پاکستان یا وہ ملک اس تجربہ کی خوبیوں اور خرابیوں سے متعارف ہو چکے ہیں جو ایک عرصہ سامراج کے زیر نگیں رہے اور اب بھی انہیں سامراجی نظاموں کی دلدل سے نکل کر اسلام کی طرف پیش رفت کرنا ہے۔ ان تنصروا الله ينصركم!!!
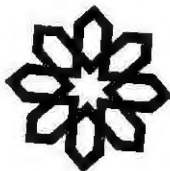
شیخ عبد الرحمن عبد الخالق — مترجم: حافظ محمد اسحق زاہد

پارلیمنٹ کی رکنیت اور سرکاری عہدے!!

سطور ذیل میں ہم کویت کے مشہور عالم شیخ عبد الرحمن بن عبد الخالق کی دور حاضر کے سلگتے ہوئے مسائل میں سے ایک اہم مسئلے پر مشتمل تصنیف کا اردو ترجمہ جو فاضل مدینہ یونیورسٹی مولانا حافظ محمد اسحق زاہد نے کیا ہے، شائع کر رہے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ جو ان دنوں نئے انتخاب کے مرحلے میں ہے، اگرچہ جذباتی فضا میں علمی سنجیدگی کا بہت کم ماحول ہے، تاہم ایک مسلمان کو اپنی زندگی میں پیش آنے والے ہر مسئلے کو اللہ کی رضا کے پیش نظر شریعت کی روشنی میں ہی جانچنا چاہئے۔ کیونکہ بہت جلد اللہ کے سامنے پیش ہو کر حساب دینا ہو گا ﴿ فمن یعمل مثقال ذرہ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرہ شرا یرہٗ ﴾

مصنف موصوف نے اپنی کتاب کو پیش لفظ کے بعد آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پیش لفظ میں زیر بحث موضوع پر موصوف نے حسب ذیل تین آراء کے حاملین کا ذکر فرمایا ہے: (الف) ایک گروہ دور حاضر کی جدید حکومتوں کے زیر نگین پارلیمنٹ کی رکنیت اور سرکاری عہدے قبول کرنے کو کفر اور ارتداد قرار دیتا ہے۔ (ب) دوسرا گروہ اس کے برعکس ایسی کوشش لازمی قرار دیتا ہے کہ مسلمان موقع کو غنیمت سمجھ کر نزاکت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ (ج) تیسرا گروہ بین بین موقف رکھتا ہے کہ مختلف حکومتوں اور حالات کے پیش نظر اسلام کے لئے فوائد بھی حاصل کئے جا سکیں لیکن ایسی کوششیں کڑی شرائط کی پابند ہونی چاہئیں۔ تاکہ مسلمان خیر کی امید پر فساد میں ہی الجھ کر نہ رہ جائیں۔

بعد ازیں مولف نے پہلے باب میں دیگر تمہیدات کے ضمن میں مسلمانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے: (الف) جہادی گروہ جو ظالمانہ حکومتوں کے رد عمل میں جہادی نعروں کے زیر اثر اس افراط کا شکار ہو گئے ہیں کہ وہ نہ صرف پارلیمنٹ کی رکنیت اور سرکاری عہدوں کو کفر وارتداد قرار دیتے ہیں بلکہ حکومتی عہدہ داروں کے خلاف جہاد و قتال کی تلقین کرتے ہیں گویا قتل و قتال کی فضا کے لئے مسلمانوں کے اندر بھی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ (ب) دوسرا گروہ نام نہاد ترقی پسند جو خود کو روشن خیال دانشور باور کراتا ہے، نہ صرف ہر جائز و ناجائز حربہ سے اقتدار پر قابض ہونے کا خواہشمند ہے بلکہ اس ضمن میں مسلمان اور غیر مسلم کا فرق کئے بغیر بالغ رائے دہی کا تصور اور عورت کی سربراہی وغیرہ جیسے مسائل میں اجتہاد کے نام پر شریعت سے تجاوز کرنے کو بھی تیار ہے۔ (ج) تیسرا گروہ جسے مصنف نے موہوم امیدوں کے سہارے علیحدگی پسند

قرار دیا ہے۔ اپنی کوششوں کا محور تبلیغ و دعوت کو بنائے ہوئے ہے اور تربیت کے پیش نظر تعلیم و تحقیق کی طرف توجہ مبذول کرنے پر بھی زور دیتا ہے۔ چنانچہ عملاً یہ گروہ موجودہ سیاست سے کنارہ کش ہے اور ان کے بعض قائدین پارلیمنٹ وغیرہ کو بدعت اور ایسی سیاست کو سلف صالحین کے طریقے سے انحراف قرار دیتے ہیں۔ (د) چوتھا گروہ جو اسلام کے زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہونے کی دعوت دیتا ہے اور یہ رائے رکھتا ہے کہ حالات کا واقعاتی جائزہ لے کر مناسب طرز عمل اپنانا چاہئے جہاں کفار سے جہاد و قتال کی ضرورت ہو وہاں جہاد و قتال کیا جائے تاکہ مسلمانوں کی عزتیں اور جان و مال محفوظ رہیں، اسی طرح مسلم معاشروں میں بھلائی کے پھیلانے اور برائی کے مٹانے کے لئے بھی بھرپور کوششیں ہونی چاہئیں۔ یہ کام صرف علمی حلقوں سے ممکن نہیں بلکہ ان کے نزدیک عملی سیاست میں شریک ہونا تربیت کا ایک ضروری حصہ ہے۔ لہٰذا موصوف نے اس گروہ کی تائید کرتے ہوئے اپنی کتاب کو اس کی حمایت کے لئے دلائل سے مزین کیا ہے۔

اگرچہ مذکورہ کتاب کا ترجمہ اور اس کے ابتدائی صفحات میں متذکرہ بالا گروہوں کے موقف کی تفصیل ہم مصنف کی ترجمانی کی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ تاہم دو تین باتیں توجہ کے قابل ہیں:

(۱) پوری کتاب، دیباچہ میں پیش کردہ تین نظریات کے حاملین میں سے صرف دو انتہائی نظریات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے اس گروہ کی پرزور تائید کی ایک کوشش نظر آرہی ہے۔ جو اقتدار پر براجمان ہونے کے لئے ہر حربہ و حیلہ کو روا رکھتا ہے۔ کاش کہ مصنف ان شروط و قیود کو بھی پیش کرنے پر توجہ فرماتے جن کے ملحوظ نہ رکھنے کی صورت میں لادین نظاموں کا حصہ بن کر انسان فتنہ کا شکار تو بنتا ہے لیکن اصلاح کے دروازے نہیں کھول سکتا۔

(۲) مصنف نے اپنی تصنیف کے پہلے باب میں ضمناً چار گروہوں کا ذکر کیا ہے جبکہ ان میں تیسرا اور چوتھا گروہ نظریاتی طور پر ایک ہی ہیں لیکن تیسرا گروہ تقویٰ کا پہلو ملحوظ رکھے ہوئے ہے تو چوتھا گروہ فتویٰ کی گنجائش پیدا کر رہا ہے۔ کیونکہ ایسے نظاموں سے علیحدگی اختیار کرنے والے عموماً دو وجہ سے اجتناب کرتے ہیں: (i) بنیادی طور پر ان نظاموں کے غیر اسلامی ہونے کی بناء پر محتاط رویہ اختیار کرنا جسے مصنف بھی تسلیم کرتے ہیں۔ (ii) فتنہ سے بچاؤ کو زیادہ اہمیت دینا جیسا کہ حدیث میں "من الدین الفرار من الفتن" تیسرا گروہ قطعاً اس بات کا قائل نہیں کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر محیط نہیں۔ بلکہ یہ لوگ جو علم و دعوت کا کام کرتے ہیں، اس میں زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی تحقیق بھی شامل ہے۔ لہٰذا تیسرا اور چوتھا گروہ ایک ہی نظریے کا حامل ہے کہ موجودہ سیاست میں عملی حصہ لینا کچھ شروط سے مقید ہے یا حالات کی مناسبت ملحوظ رکھ کر مساعی درست رخ پر ہونی چاہئیں۔ غالباً کتاب کے چوتھے باب

میں شیخ ناصر الدین البانی کا موقف اس گروہ کی ایک طرح سے ترجمانی ہے جبکہ دیگر مشہور بزرگ علماء کا عملی رویہ بھی اسی موقف کی تائید ہے۔ چنانچہ کتاب میں گروہی تقسیم اور ان گروہوں کا صحیح موقف واضح نہیں ہے۔ پھر بحث تو مزید مجمل ہو کر پارلیمنٹ کی رکنیت کے جواز اور عدم جواز تک محدود ہو گئی ہے۔ عملاً تیسرے گروہ پر علیحدگی پسند کی پھبتی اور نظام میں تبدیلی لانے کے طریق کار سے نابلد ہونے کا الزام بھی درست نہیں۔ آج کل کی زندگی کی وسعتوں میں سارے میدانوں میں کام کرنا ممکن نہیں بلکہ علمی میدانوں میں بھی تخصیص ضروری ہے۔ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے

"Jack of all, Master of none"

(۳) اس وقت اکثر مسلمان ملکوں میں سامراج کی سازشوں سے جس طرح ملکی حدود کی بندربانٹ ہو چکی ہے اور غیر ملکی سامراج نے بظاہر مسلمانوں کو آزادی دے کر انہی کے رنگ و نسل والے اپنے گماشتے ان پر مسلط کر رکھے ہیں اور وہی سامراجی نظاموں کے محافظ ہیں۔ اس لئے تیسرے اور چوتھے گروہ دونوں کے سامنے نظام کی تبدیلی کا پروگرام واضح نہیں ہے اور آج یہی چیلنج علمی سطح پر مسلمانوں کو درپیش ہے۔ اسلام اگرچہ اپنی وسعتوں کی بنا پر سیاست و معیشت میں نئے سے نئے تجربات کی حوصلہ شکنی نہیں کرتا لیکن ان تجربات کو اسلامی اصول و ضوابط سے ضرور مشروط کرتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے زمانہ جاہلیت کی ہر چیز کی مخالفت نہیں کی بلکہ جن چیزوں کو تبدیل نہیں کیا، یا تبدیلی کے لئے ہدایات نہیں دیں، وہ تقریری سنت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی اصول کے تحت آج جدید حکومتوں کے تمام نظاموں کو تہ و بالا کرنے کی ہم حمایت نہیں کرسکتے۔ اس بارے میں حکمت عملی کی حد تک ہم مصنف کے موقف کی تائید کرتے ہیں۔

(محدث)
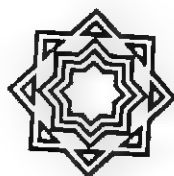
پیش لفظ

امت مسلمہ اپنی باوقار و پر شکوہ تاریخ کی چودہویں صدی میں سقوط خلافت اسلامیہ کے المناک حادثے سے دوچار ہو کر چھوٹے چھوٹے ملکوں اور قوموں [1] میں تقسیم ہوگئی۔ اس المیے کا شکار ہونے کے بعد امت پر رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے بعد، انگریز، فرانسیسی اور اطالوی استعماریوں نے امت مسلمہ کی اس قبائے وحدت کو چاک کر کے مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہر نئے ملک پر ایک ایسا دستور نافذ کردیا جو مغربی جمہوری تصورات و نظریات پر مبنی تھا۔ سامراجیوں نے ان دساتیر کے علاوہ ہر قوم کے لئے جداگانہ قومی مقاصد و اہداف مقرر کردیئے۔ پھر ان اہداف کو حاصل کرنے کے لئے ان قوموں کی تعلیم و تربیت کے لئے خاص نظام وضع کئے گئے۔ غرضیکہ قانون سازی کے ذریعے سیاسی، معاشی، دفاعی اور سماجی تمام شعبوں میں اپنے نظریات کو پوری طرح داخل کردیا۔

اس نئے نظام میں نئی نسلوں کی نشوونما اس نہج پر ہوئی کہ وہ خود کو امت مسلمہ سے منسوب کرنے یا مسلم قوموں کی دوستی سے گریز کرنے لگے۔ اور نجی زندگی میں حلال و حرام کی تمیز اور احکام اسلامی کی پابندی سے جی چرانے لگے۔ قومی امتیازات کو اتنی اہمیت دی گئی کہ ہر مسلم قوم دوسری قوم سے نہ صرف جذبات و احساسات اور طرز بود و باش میں الگ ہوگئی بلکہ دوستی، میل ملاپ، راہ و رسم، روایات، تقلید و اتباع اور قومیت میں بھی ہر مسلم قوم علیحدہ رستے پر چل نکلی۔ مغائرت کی یہ روش بتدریج دشمنی کی حد تک پہنچ گئی اور نوبت مسلم ممالک کے درمیان سرحدی جنگوں تک جا پہنچی۔ اسلام کی نام لیوا قومیں سرکش ہو کر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں۔ بجائے اس کے ان میں اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی ہوتی، بغض، کینہ، لالچ اور انتقام کے شجر خبیثہ نے ان میں جڑ پکڑلی۔ اور وہ جن کا اللہ ایک، نبیؐ ایک، دین بھی ایمان بھی ایک، حرم پاک بھی ایک اور قرآن بھی ایک تھا، ان کی راہیں جدا جدا ہوگئیں اور وہ قومیں اور فرقوں میں بٹ کر رہ گئے۔

امت ایک ایسی اندوہ ناک صورت حال میں مبتلا ہوگئی، جس سے زیادہ بری حالت سابقہ تمام صدیوں میں امت مسلمہ پر نہیں گزری تھی۔ اس تناظر میں دعوت الی اللہ، اقامت دین، احیائے خلافت راشدہ اور اتحاد امت کے لئے موزوں ترین لائحہ عمل کی تلاش کی ضرورت ہے۔ داعیان اسلام امت مسلمہ کو کفار سے بچانے، دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنے، زمین پر اللہ کی حجت قائم کرنے اور اللہ کے کلمے کو غالب کرنے سے متعلق لائحہ عمل کے بارے ابھی یکسو نہیں ہوئے۔ وہ اس تردد و تذبذب میں مبتلا ہیں کہ کام کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ دعوت الی اللہ کا آغاز پہلے کہاں اور کیسے ہو؟ موجودہ حالات میں

تبدیلی لانے کے لئے کیا راہیں اختیار کی جائیں اور وہ کون سے ممکنہ اور جائز ذرائع موجود ہیں جن کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

دعوت الی اللہ کے میدان میں دور حاضر کی مناسبت سے جو شرعی حکمت عملی اور موزوں پالیسی ہونی چاہئے، اس کے بارے میں ہم نے متعدد رسائل تصنیف کیے ہیں۔ یہ کتابچہ جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ بھی دعوت الی اللہ کے وسائل وذرائع میں سے ایک کے متعلق خاص کیا گیا ہے اور وہ ہے:

"موجودہ سسٹم کے تحت قانون ساز اسمبلیوں *Legislative Assemblies (Parliament)* کی رکنیت اور سرکاری عہدے قبول کرنے کا حکم ہے؟"

زیر بحث سوال یہ ہے کہ کیا داعیان اسلام کے لیے موجودہ حکومتوں کے ماتحت رہ کر سرکاری ذمہ داریوں مثلاً وزارت، قضاء اور اسی طرح غیر سرکاری محکموں کی سربراہی کا قبول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا موجودہ قوانین کے تحت آئین ساز اسمبلیوں میں منتخب ہو کر جانا جائز ہے؟

یاد رہے کہ یہ وہ قوانین ہیں جو نظام جمہوریت پر مبنی اپنے اساسی دستوروں کے مطابق بالادستی اور اقتدار اعلیٰ (*Sovereignty*) عوام کے لئے قرار دیتے ہیں اور اسی کو طاقت واقتدار کا سرچشمہ سمجھتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ ان کے مطابق عوام ہی اصل حاکم ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس اسلامی عقیدے کے بالکل الٹ ہے جس میں اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کی شریعت کو سب نظاموں پر بالادستی حاصل ہے:

﴿ ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ﴾

"سوائے اللہ کے فرمانروائی کسی کی نہیں ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اس کی عبادت و اطاعت کرو"

یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں دور حاضر کے داعیان اسلام کی آراء باہم مختلف ہیں، کچھ ایسے حضرات ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ موجودہ حکومتوں کے زیر سایہ رہ کر سرکاری ذمہ داریاں سنبھالنا اور پارلیمنٹ کی رکنیت قبول کرنا کفر و ارتداد اور اسلام سے خروج ہے، جبکہ بعض دوسرے ارباب علم کا کہنا ہے کہ یہ ایسا فریضہ ہے جس سے لاتعلقی قطعاً جائز نہیں اور تیسرے وہ علماء کرام ہیں جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بعض مواقع پر اور بعض حکومتوں میں ایسا کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

اس کتابچے میں ہر رائے کو تفصیل سے پیش کرنا اور پھر دلائل کے ترازو میں انہیں تولنا میرا ہدف نہیں ہے۔ میں، بحمد اللہ وتوفیقہ، صحیح اور راجح موقف کے ذکر کرنے پر اکتفاء کروں گا، میں اپنے موقف کی تائید میں کتاب و سنت سے دلائل، سلف صالحین کے اقوال اور میدان دعوت میں کام کرنے والوں کے تجربات بھی پیش کروں گا کیونکہ تجربہ بھی دلائل میں سے ایک دلیل ہے، فرمان الٰہی ہے: ﴿ فاعتبروا یا

اولی الابصار ﴾ "اے آنکھوں والو، دوسرے کے حالات سے سبق سیکھو!"

"سو عبرت پکڑو، اے آنکھوں والو!"

حدود الٰہی کو پھلانگنے اور انہیں پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کی عزت کو ذلت و اھانت میں تبدیل کر دیا تو ان کے اس برے انجام پر مومنین کو تنبیہ کی گئی کہ "اے آنکھوں والو! دیکھو اور عبرت حاصل کرو"، گو یہ آیت یہود مدینہ کے مذکورہ قبیلے کے متعلق خاص طور پر نازل ہوئی تھی لیکن العبرة بعموم اللفظ (شرعی معاملات میں مخصوص واقع کی بجائے معتبر شے، الفاظ کا عمومی مفہوم ہوتا ہے) کے اصول کے تحت ہر ذی شعور سے یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ وہ واقعات و حالات سے سبق حاصل کرے اور ان کے نتائج سے استفادہ کرے۔

اور نہیں تو کم از کم اتنا تو ضرور ہے کہ مذکورہ بالا آیت حجیت قیاس کے دلائل میں سے ایک ہے اور ہر صاحب علم جانتا ہے کہ قیاس ایک صحیح شرعی دلیل ہے۔

میں اس رسالے میں جو موقف اختیار کروں گا، اس کی تقویت کیلئے "مصالح و مفاسد" کو بھی بطور دلیل پیش کروں گا کیونکہ فقہ و اجتہاد کے دلائل کے نلئے مصالح و مفاسد کو کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کے ہمراہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے اس کام میں برکت ڈالے اور اسے باعث نور و ہدایت بنائے اور ہمیں حق اور صحیح راستے کی توفیق دے۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه، انک انت السمیع العلیم

عبد الرحمن عبد الخالق، کویت

باب اول
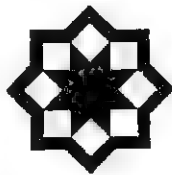
ضروری تمہیدات

۱- فرمانروائی صرف اللہ کے لیے

(الف) سب سے پہلے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ جمہوری نظام جو عوام کو حاکم اور اسی کو تمام طاقتوں کا سرچشمہ قرار دیتا ہے، ایک غیر اسلامی نظام ہے اور اسلام کی سب سے اہم خصوصیت اور سب سے بڑی بنیاد کے منافی ہے، جو یہ ہے کہ بالادست (Supreme) اور مقتدر اعلیٰ (Sovereign) اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، سو ہر چھوٹی بڑی چیز پر اللہ ہی کی فرمانروائی قائم ہے اور اللہ کی شریعت کے خلاف ہر فیصلہ باطل ہے،

اللہ کے حکم اور اس کی شریعت کے منافی فیصلہ کرنے والا طاغوت ہے، اگر وہ اللہ کے فیصلے کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے فیصلے کو فوقیت دیتا ہے باوجودیکہ وہ یہ جانتا ہے کہ یہ فیصلہ اللہ کی شریعت کے خلاف ہے تو وہ کافر ہے اسی طرح خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرمانبرداری بالکل ناجائز ہے، اور دین کے ایک حصے پر عمل پیرا ہونا اور دوسرے کو اپنے اختیار سے چھوڑ دینا بھی کفر ہے۔

(ب) موجودہ صورت حال: یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جمہوری یا مطلق العنان جابرانہ نظام و قوانین اس وقت امت مسلمہ میں جاری و ساری ہیں۔ یہ محض کوئی افسانہ یا من گھڑت نظریہ یا محض خیال نہیں ہے۔ اس وقت اگر اختلاف ہے تو وہ صرف اس چیز میں ہے کہ ان دساتیر اور خود ساختہ قوانین کی موجودگی میں کیسا شرعی رویہ اپنایا جائے!! اور ان کا سامنا کس حکمت عملی کے تحت کیا جائے!!

۲- موجودہ حکومتوں کے متعلق داعیان اسلام کے نظریات

آج کل اسلام کے لیے کام کرنے والے حضرات علماء کرام کے نظریات اور ان کے دعوتی طریقوں کی اچھی طرح چھان بین کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زیر بحث موضوع میں انہوں نے چار قسم کی پالیسیاں اپنائی ہیں:

(الف) جہادی فکر: "جہاد" کے نام سے جو حکمت عملی اپنائی گئی ہے اس کا نچوڑ یہ ہے کہ موجودہ قوانین و دساتیر کے خلاف تلوار کے ساتھ جنگ کرنا واجب ہے۔ ان خود ساختہ قوانین کے تحت قائم حکومتوں اور ان کے لیے ڈھال بننے والی فوج، پولیس اور خفیہ ایجنسیوں سے لڑنا مباح اور انہیں طاقت و تشدد سے معزول کرنا فرض ہے اور اللہ کی زمین میں اللہ کی حکومت قائم کرنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

اس پالیسی کو جن لوگوں نے اختیار کیا ہے ان کے خیال میں سرکاری عہدوں کو قبول کرنا اور

پارلیمنٹ کا رکن بننا کفروارتداد ہے نیز دائرہ جہاد اتنا وسیع ہے کہ ہر اس شخص کے خلاف جاتا ہے، جو اسلام پر حملہ آور ہوتا اور اس پر تنقید کرتا ہو۔

یہ پہلی حکمت عملی کا خلاصہ ہے، جس کے موقف کی حقیقت اور تفصیل کے ساتھ تردید الحمدللہ ہم اپنی کتاب "فصول من السیاسة الشرعیة فی الدعوة الی اللہ" [۴] میں دلائل کے ساتھ کر چکے ہیں۔

(ب) روشن خیال مسلمان (ترقی پسند گروہ): موجودہ سسٹم کی پروردہ حکومتوں کے متعلق دوسری پالیسی بعض لوگوں نے یہ اختیار کی ہے کہ اسلام میں چونکہ تنگ نظری، دقیانوسیت اور بے جا روک ٹوک نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طرح سے کھلی آزادی ہے، سو جمہوری نظام دین اسلام کے مخالف نہیں، موافق ہے کیونکہ اس کے اور اسلامی شورائی نظام کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہ دور حاضر کی حکومتیں چند ایک کو چھوڑ کر اکثر معاملات میں عملاً اسلام کو نافذ کرتی ہیں۔

(ستم بالائے ستم یہ ہے کہ) یہ فریق بہت سارے اسلامی احکامات سے دستبردار ہونے کے لیے بھی تیار ہے مثلاً عورت کا اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونا، مسلمانوں کے ساتھ مساوات و برابری کے مرتبے والا سلوک غیر مسلموں سے بھی کرنا، کئی رنگا رنگ چیزوں جنہیں آرٹ (Art) کا نام دیا گیا ہے مثلاً گانا بجانا، موسیقی وغیرہ کو مباح قرار دینا، موجودہ سودی بنکاری نظاموں کو درست کہنا، مسلم گروہوں کے مابین عقائد کے اختلافات کو یکسر نظرانداز کرنا، سنت و اجماع کے بہت سارے احکامات کو پس پشت ڈالنے کی غرض سے اجتہاد کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھولے رکھنا اور شرعی مسائل میں عقل، ذوق سلیم اور مصلحت عامہ کو حاکم و فیصل قرار دینا۔

دانشوروں اور لیڈروں کا یہی وہ گروہ ہے جو موجودہ صورت حال کو اسلام کے صحیح سیاسی نظام میں تبدیل کرنے کا معقول پروگرام دینے کی بجائے زیادہ تر اپنے تحریکی طریقۂ کار میں ایسا پروگرام رکھتا ہے جو بگڑی ہوئی صورت حال کو جواز کا رنگ دے کر اسی کو رواج بنا دے۔

(ج) گوشہ نشینی اور موہوم امید: آج کل کے "داعیان اسلام" کا تیسرا فریق وہ ہے جس کے پاس موجودہ المناک صورت حال میں تبدیلی لانے کے لیے کوئی واضح تصور ہے اور نہ اس کے پیش نظر کوئی جائز رد عمل ہے۔ وہ خلوت نشینی، علیحدگی کے باوجود حالات کے خود بخود اصلاح پذیر ہونے کا منتظر ہے۔ اس فریق کے بعض اہل علم کے خیال میں تقاضائے وقت یہ ہے کہ علم حاصل کیا جائے اور موجودہ حکومتوں کے زیر سایہ خواہ کوئی عام ذمہ داری ہو یا پارلیمنٹ کی رکنیت ہو، اس سے لازماً دوری اختیار کر کے لوگوں کی تربیت کی جائے، جبکہ اس گروہ کے چند اور "علماء" کا موقف ہے کہ آئین ساز اسمبلیوں میں جانا دین اسلام میں

بدعت کے مترادف اور سلف صالحین کے منہاج سے خروج ہے۔ ان میں سے بعض تو رکن اسمبلی پر کفر و ارتداد کا فتویٰ بھی صادر کر دیتے ہیں۔

(د) سارے اسلام پر عمل مطلوب ہے: تجدید و اقامت دین کے لیے کام کرنے والوں کا چوتھا گروہ وہ ہے جسے آپ "سارے اسلام پر عمل کرنے والی جماعت" کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کا نقطۂ نظریہ ہے کہ موجودہ صورتحال کے مقابلے میں ایسا ردعمل اختیار کرنا چاہئے جو اس کے لیے مناسب و موزوں ہو (کیونکہ مریض کا علاج اس کے مزاج کو جانچ پرکھ کر تجویز کیا جاتا ہے)۔ پورے اسلام پر عمل پیرا ہونا اس جماعت کا عقیدہ ہے۔ لہٰذا کفار کی یلغار کو روکنے اور مسلمانوں کی عزتوں، ان کی جانوں اور مالوں کی حفاظت کرنے کے لیے جہاد بالسیف کا موقع ہو تو وہاں پر جہاد واجب اور اگر امربالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے موزوں موقع ملتا ہو تو اس شرعی حکم پر عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے (اسی طرح جہاں جس کام کی ضرورت ہو وہاں اس کی موزونیت و مناسبت کو دیکھ کر اسے ادا کرنا ضروری ہے)

نیز حاملین دین اور داعیان اسلام کو اپنا دعوتی مشن مکمل استعداد کے ساتھ ہمیشہ جاری رکھنا چاہئے کیونکہ لوگوں کی تربیت عملی جہاد کے میدانوں میں ثمرآور ہوتی ہے نہ کہ صرف مجالس علم میں، لہٰذا علم و عمل دونوں کاموں کو بیک وقت انجام دینا ضروری ہے۔

اس جماعت کی رائے میں موجودہ حکومتوں کے زیرسایہ سرکاری عہدوں کی ذمہ داری اٹھانا اور قانون ساز اسمبلیوں کا رکن بننا جائز ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ بعض مخصوص حالات کے پیش نظر اور چند شرائط کے دائرے میں رہتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو قبول کرنا اور رکن پارلیمنٹ بننا ہمارے نزدیک واجب بھی ہو جاتا ہے۔[۳]

۳۔ عوام الناس کی تمنائے نفاذ اسلام

ہمارا نکتہ نظریہ ہے کہ اسلامی ممالک اور ان کے عوام الناس اب بھی دین حنیف پر قائم ہیں، اپنے اندر اللہ کی شریعت کی عملداری چاہتے ہیں اور اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، لیکن ان کی اس خواہش و آرزو کے خلاف "زور آور چور" اور وہ منافق حکمران رکاوٹ بن جاتے ہیں جو بظاہر تو اسلام کی قبا پہن لیتے ہیں اور بباطن الحکم بغیر ما انزل اللہ میں اللہ کے دشمنوں کے ہمنوا ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض اسلام اور اسلامی شریعت سے اپنی دشمنی اور عصر حاضر کے لیے اس کی غیر موزونیت کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں۔ گو ان کے کفر اور دائرۂ اسلام سے ان کے خروج کے متعلق شک نہیں کیا جا سکتا لیکن خواہ وہ منافق حکمران ہوں یا علی الاعلان اسلام دشمن حکام، ہر دو صورت میں دعوت و جہاد کا کام اس کی مقررہ حدود میں رہ کر کرتے رہنا چاہئے۔ نیز اسلام پسندوں اور ان لوگوں کو حق

الوسع طاقتور اور مضبوط بنانا ضروری ہے جو اسلامی شریعت کے عوض عامیانہ حکومت کے طلبگار نہیں ہیں۔

ہمارے سابقہ کلام کا مفہوم یہ ہے کہ نہ ہم مسلم اقوام اور مسلم معاشروں کے کفر کے قائل ہیں اور نہ اس بات کے کہ جہاد کا آغاز اس انداز سے کیا جائے کہ مسلم معاشرے ہی سے چند لوگوں کو مسلمان اور دوسروں کو کافر قرار دے کر دونوں کو الگ الگ صفوں میں لا کھڑا کیا جائے، جیسا کہ بعض داعیان اسلام کا موقف ہے اور متعدد مواقع پر ہم اس کا تفصیلی رد کر چکے ہیں۔

۴۔ شرعی طور پر پارلیمنٹ کی رکنیت اور سرکاری عہدے قبول کرنے میں کوئی فرق نہیں

موجودہ جمہوری یا استبدادی حکومتوں میں قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننے اور دیگر انتظامی عہدوں کی ذمہ داری اٹھانے میں شرعی احکام کی رو سے قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ کوئی کہنے والا اگر یہ کہے کہ یہ تو ظالمانہ بلکہ کافرانہ حکومتیں ہیں (ان کے زیر سایہ رکن پارلیمنٹ بننا کیونکر جائز ہو گا!!) تو اس کا جواب یہ ہے کہ قانون ساز اسمبلی (Legislative Assembly، مقننہ) اور انتظامی اتھارٹی (Executive Power، انتظامیہ) دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ ان کا منبع ایک ہی نظام ہے، بلکہ بعض حالات میں مقننہ میں جانا نسبتاً زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک وزارت کے سیکرٹری کو لیجئے! وہ ایک انتظامی عہدے کے ذمہ دار کی حیثیت سے مقننہ کی طرف سے جاری ہونے والے احکامات کو عملاً نافذ کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی احکام کا پابند رہنے والے ایک مسلمان کی شرعی حالت مقننہ میں رہتے ہوئے بہت بہتر ہوتی ہے اور اس میں وہ اپنے دین کو زیادہ اچھے طریقے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ کسی خلاف اسلام قانونی بل پر دستخط کرنے اور اسے پاس کرنے کے سلسلے میں جمہوری نظام کے مطابق اس پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پر یہ لازم ہو گا کہ وہ ایسے قانون پر اعتراض کرے جو خلاف اسلام ہو۔ اور اسے یہ حق بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ انتظامیہ کے کسی ذمہ دار کے خلاف آواز بلند کرنے اور ان "پارلیمانی تحفظات" (Parliamentary Immunities) سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے جو ممبر پارلیمنٹ کو آزادانہ رائے کا اختیار دیتے ہیں۔

رہا انتظامی عہدے دار (خواہ وزیر ہو یا کوئی اور) تو وہ مقننہ کے ایک رکن کی صلاحیتوں اور اس کے اختیارات میں اس کا برابر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ انتظامیہ کا ایک فرد ہے جو جمہوری قوانین کے مطابق مقننہ کے احکامات صرف عملاً نافذ کرنے کی پابند ہوتی ہے اور اپنے محدود اختیارات کے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرتی ہے۔ جبکہ رکن پارلیمنٹ کو ہر بات کہنے، ہر چیز پر اعتراض کرنے اور شرعی قوانین کے بل پیش

کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

ہماری اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ پارلیمنٹ کا رکن اگر حق کو مضبوطی سے تھام کر رکھے تو اس کا کردار اور عمل بہ نسبت وزیر یا کسی اور عہدے دار کے زیادہ محفوظ و مامون اور اس کے دین کے لیے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ غرض اختیار و اجتہاد کا دائرۂ کار انتظامی عہدے دار کے لیے محدود اور ممبر پارلیمنٹ کے لیے وسیع تر ہوتا ہے۔

۵۔ لوگوں کے معاملات کا ذمہ دار بننا دین کے چند بڑے تقاضوں میں سے ہے:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"یہ جاننا ضروری ہے کہ لوگوں کے معاملات کا ذمہ دار بننا دین اسلام کے بڑے تقاضوں میں سے ہے بلکہ دین و دنیا کا وجود اسی سے ہے کیونکہ بنی آدم کی (دینی و دنیاوی) مصلحتیں اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں جب وہ ایک دوسرے کی ضرورتوں کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور اجتماع کے لیے ایک ذمہ دار کا ہونا لازمی ہوتا ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:

"جب تین افراد سفر میں نکلیں تو وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنائیں" (رواہ ابوداؤد)

اس کے بعد شیخ الاسلام نے اس کے متعلق چند دیگر احادیث نبویہ اور اقوال سلف بیان کیے ہیں، پھر کہتے ہیں:

"لہٰذا ذمہ داری کو دین اور تقرب الٰہی کا ذریعہ تصور کر کے قبول کرنا واجب ہے کیونکہ امارت (ذمہ داری) میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری اللہ کے قریب کرنے والی بہترین چیزوں میں سے ایک ہے۔"

پھر ابن تیمیہؒ ذکر کرتے ہیں کہ امارت میں لوگوں کی حالت کا بگڑ جانا اس سبب سے ہوتا ہے کہ لوگ امارت کے ذریعے قوت، اقتدار اور مال و دولت کی حرص و لالچ میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ مسلمانوں میں سے نیکوکار لوگ اپنے آپ کو اونچا کرنے، شہرت حاصل کرنے اور زمین میں فساد بپا کرنے کے لیے نہیں بلکہ اللہ کا قرب حاصل کرنے، دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے اور اس کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے دولت و ثروت اور امارت کے خواہاں ہوتے ہیں اور اسی میں ہی دین و دنیا کی بھلائی ہے۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں:

"اور جب اہل حل و عقد میں سے بہتوں پر حب جاہ و مال غالب آ گئی اور وہ اپنی اپنی ذمہ داریوں میں ایمان کی حقیقت سے کنارہ کش ہو گئے تو بہت سارے لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ امارت ایمان اور کمال دین کے منافی ہے۔ پھر ان میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے دین کو (امارت اور مال و دولت پر) فوقیت دیتے ہوئے اس چیز سے منہ پھیر لیا کہ جس کے بغیر دین مکمل ہی نہیں ہوتا.....

جبکہ دوسروں نے امارت کی خواہش رکھتے ہوئے اسے قبول کر لیا مگر یہ کہہ کر دین سے منہ موڑ لیا کہ امارت دین کے منافی ہے (یعنی امارت سنبھال کر دین پر عمل پیرا ہونا ان کے نزدیک ناممکن ٹھہرا) اور دین ان کے نزدیک ذلیل اور قابل ترس مقام پر بند ہو کر رہ گیا نہ کہ بلند و بالا اور باعزت مقام پر......

اسی طرح جب یہود و نصاریٰ پر تکمیل دین سے بے بسی اور بے اختیاری غالب آگئی تھی اور اقامت دین کی سلسلے میں جب انہیں آزمائشوں نے گھیر لیا تو ان سے گھبرا کر ان کا سسٹم کمزور پڑ گیا تھا اور شرعی امارت کو وہ لوگ حقیر سمجھنے لگ گئے جن کے خیال میں اس کے ساتھ ان کی اپنی اور ان کے علاوہ دوسروں کی مصلحتیں قائم نہیں رہ سکتی تھیں۔(۴)

اور یہ دونوں غلط راستے —— اس آدمی کا راستہ جس نے دین کی طرف اپنی نسبت کی اور دین کو اقتدار، جہاد اور مال کے ذریعے مکمل نہ کیا اور اس شخص کا راستہ جو اقتدار، مال اور جنگ کی طرف تو متوجہ ہوا لیکن اس کے ذریعے اس نے اقامت دین کا عزم نہ کیا —— ان لوگوں کے ہیں جن پر اللہ کا غضب ہوا اور جو گمراہ ہو گئے، پہلا راستہ گمراہ نصرانیوں کا اور دوسرا غضب کیے گئے یہودیوں کا،

صراط مستقیم وہ ہے جس پر اللہ کی طرف سے انعام کئے گئے لوگ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور نیک لوگ چلے، وہی راستہ ہمارے نبی محمد ﷺ، ان کے خلفاء و اصحاب اور ان حضرات کا ہے جو ان کے راستے پر چلتے رہے، اور جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گئے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے اور انہیں کے لیے اللہ تعالیٰ نے وہ باغات تیار کر رکھے ہیں جن کی نیچے نہریں چلتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔"

پھر شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

"چنانچہ اس کے لیے حسب استطاعت ہر مسلمان پر کوشش کرنا واجب ہے۔ جو شخص کوئی ایسی ذمہ داری لیتا ہے کہ اس میں وہ اللہ کی فرمانبرداری، حتی الوسع اقامت دین اور مصالح مسلمین کا عزم کرتا ہے اور جہاں تک ہو سکتا ہے واجبات پر عمل اور محرمات سے اجتناب کرتا ہے، تو اس کا ایسی چیز پر مواخذہ نہیں ہو گا جس سے وہ عاجز آ جاتا ہے۔ کیونکہ نیک لوگوں کا ذمہ داریاں سنبھال لینا بہ نسبت برے لوگوں کے امت مسلمہ کے لیے بہرحال بہتر ہے اور جو شخص اقتدار و جہاد کے ذریعے اقامت دین سے عاجز ہو لیکن حسب طاقت خیر و بھلائی کے کام کرتا رہتا ہو، اسے اس چیز کا مکلف نہیں بنایا جا سکتا جس پر اسے قدرت ہی حاصل نہیں"(۵)

ابن تیمیہؒ کا یہ عمدہ کلام کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہے، کاش کہ داعیان اسلام اس نفیس ضابطے اور اصول کی طرف متوجہ ہوں!!

باب دوم

کافرانہ حکومتوں میں عہدے قبول کرنے کے جواز پر قرآن و سنت سے دلائل

ظالمانہ اور حتیٰ کہ کافرانہ حکومتوں میں سرکاری عہدوں کی ذمہ داری قبول کرنے کی مشروعیت (بشرطیکہ وہ عہدہ دار حسب استطاعت حق و انصاف قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہو) پر سب سے واضح دلائل حضرت یوسف علیہ السلام اور نجاشی رحمہ اللہ کی حکومتی ذمہ داریاں ہیں۔

(ا) حضرت یوسف علیہ السلام اور مصر کی وزارت خزانہ

اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ اسلام کافروں کے ملک میں واحد مومن تھے۔ وہ جب طفولیت میں تھے تو انہیں کافروں ہی کی ایک جماعت نے بطور غلام فروخت کیا تھا لیکن وہ ذات جس نے تاریک کنویں میں ان کی حفاظت کی، اسی نے انہیں ایک ایسے معزز آدمی کے گھر میں مسکن عطا کیا جس نے ان سے اپنے بچے کی طرح سلوک کیا۔

﴿ وقال الذی اشتراہ من مصر لامراتہ اکرمی مثواہ عسی ان ینفعنا او نتخذہ ولدا ﴾

"اور مصر سے جس شخص نے اسے خریدا، اس نے اپنی بیوی سے کہا: اسے عزت و اکرام سے رکھو، شاید یہ ہمارے کام آئے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں"

اور جس نے انہیں خریدا اور ان سے اچھا رویہ رکھا، اس کے بارے میں یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿ انہ ربی احسن مثوای انہ لایفلح الظلمون ﴾ یعنی "وہ میرا مالک (مربی) ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا، (لہٰذا میں اگر اس کے گھر میں خیانت کروں) تو ظلم و ناانصافی کرنے والے کامیابی نہیں پائیں گے۔" آیت میں "ربی" سے مراد "میرا آقا" ہے جو کہ عزیز مصر تھا اور جس کی بیوی نے ظلم و زیادتی کرتے ہوئے آپ پر تہمت لگائی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بری کر دیا تھا اور اس کی اور اس جیسی دیگر شرانگیز عورتوں کی سازش سے انہیں نجات دی تھی۔ پھر یوسف علیہ اسلام جیل میں رہتے ہوئے دین اور توحید الٰہی کی طرف حسب استطاعت دعوت دیتے رہے اور جب ان کی براءت و بے گناہی ثابت ہو گئی تو وہ سربلند ہو کر اور فاتح بن کر جیل سے رہا ہو گئے۔ وہ جنہوں نے ان پر تہمت لگائی تھی اور ان کی اذیت قلب و جسم کا باعث بنیں تھیں، ذلیل و خوار ہو کر رہ گئیں۔

اب اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا نادر موقع عنایت فرمایا کہ وہ بہتر پوزیشن میں آکر دعوت الی اللہ کا کام کر سکیں اور کافرانہ نظام میں رہ کر عدل و انصاف کی راہیں کھول سکیں جن کے مصری شہنشاہ دلدادہ تھے اور اپنی عوام کے بمقابل ایک امتیازی مقام پر فائز تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس مناسب موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا عزم کرلیا تاکہ وہ ایک تو بہتر پوزیشن میں دعوت الی اللہ اور قیام عدل کا فریضہ سرانجام دے سکیں اور دوسرا مصری عوام کو قحط سالی کے اس خطرناک عذاب سے نجات دلا سکیں جس کے متعلق انہیں معلوم تھا کہ وہ آئندہ سات سالوں میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔ چنانچہ بادشاہ مصر کو اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: ﴿ اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم ﴾

"مجھے ملک کے خزانوں کا ذمہ دار مقرر کردو، میں پوری طرح حفاظت کرنے اور (مالی معاملات کو) جاننے والا ہوں"۔

اقتدار، قیام عدل، لوگوں کے اموال کی حفاظت اور انہیں متوقع قحط سالی کے حادثے سے بچانے کی صلاحیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے یوسف علیہ السلام پر اپنا احسان قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿ وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوا منها حیث یشاء نصیب برحمتنا من نشاء ولا نضیع اجر المحسنین ﴾

"اور اس طرح ہم نے زمین میں یوسف کو بھرپور قدرت عطا کی، وہ اس میں جہاں چاہتا اترتا (اور حسب منشاء تصرف کرتا)، ہم اپنی رحمت سے جسے چاہیں نوازتے ہیں اور نیکوں کا ثواب ضائع نہیں کرتے"

یاد رہے کہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ ایسی قوم سے رہا جس میں تمام لوگ کافر تھے۔ ان کے مالوں کی حفاظت اور انہیں بہت بڑی مصیبت (خشک سالی) سے آہستہ آہستہ نجات دلانے میں انہوں نے ان میں سے مساویانہ سلوک تو کیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ باوجود ایک عادل وزیر خزانہ ہونے کے تمام معاملات میں حق و عدل قائم نہیں کرپائے تھے کیونکہ مصری حکومت کے کئی ایک ایسے مالی قوانین بھی تھے جو عدل و انصاف کے سراسر منافی تھے (اور جنہیں تبدیل کردینا تقریباً ناممکن تھا) مثلاً اراضی اور غلہ جات پر عائد کئے جانے والے بعض محصولات، بادشاہ، وزراء اور اس کے گردوپیش رہنے والے خواص کے لیے مخصوص فنڈز۔ ناحق طریقے سے مال لینا، اسے غیر عادلانہ و غیر مساویانہ انداز میں خرچ کرنا اور اس طرح کے دیگر معاملات جو کافر حکمرانوں کے متعلق زباں زد عام تھے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"اور اسی باب سے یوسف علیہ السلام کا مصر کی وزارت خزانہ کو سنبھالنا بلکہ خود سوال کر کے اس عہدے کو اپنے ذمے لینا ہے حالانکہ بادشاہ مصر اور اس کی قوم کی سارے لوگ کافر تھے، ارشاد

باری ہے:

﴿ ولقد جاءكم يوسف من قبل بالبينت فما زلتم في شك مما جاءكم به ﴾

"اور یقیناً تمہارے پاس اس سے پہلے یوسف (علیہ السلام) واضح دلائل لا چکے ہیں، لیکن تم پھر بھی اس شریعت کے متعلق شک کرتے رہے جسے وہ لائے تھے۔"

اور فرمایا: ﴿ یاصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر، ام الله الواحد القهار ماتعبدون من دونه الااسماء سميتموها انتم وآبائكم ﴾

"اے جیل کے میرے ساتھیو! بھلا کئی معبود جو جدا جدا ہیں وہ بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو زبردست ہے؟ یوں ہی تم اسے چھوڑ کر ناموں (کے دیوتاؤں) کی پوجا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں"۔

اور یہ بات ممکن ہے کہ کفر کی موجودگی میں لوگوں کے مال زبردستی ہتھیانے اور انہیں بادشاہ کے حاشیہ برداروں، گھر والوں، فوجیوں اور عام لوگوں پر خرچ کرنے کا ان کے ہاں کوئی خاص طریق کار ہو جو سنت انبیاء اور ان کے عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہو اور یوسف علیہ السلام کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اللہ کے دین کو مکمل طور پر عملاً نافذ کرنے کے لیے جو کچھ چاہتے کرتے کیونکہ جس قوم میں وہ موجود تھے، اس نے آپؑ کی دعوت قبول ہی نہیں کی تھی۔ لیکن جہاں تک ممکن ہو سکا، انہوں نے انصاف کیا۔ لوگوں سے نیکی کرتے رہے اور اقتدار کے ذریعے اپنے گھر والوں میں سے مومنوں کو عزت و اکرام سے نوازا اور قدر و منزلت کے اس مقام پر لا کھڑا کیا جو اقتدار کے بغیر نہیں مل سکتا تھا، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں شامل ہے: ﴿ فاتقوا الله ما استطعتم ﴾

"سو جہاں تک ہو سکے، اللہ سے ڈرتے رہو" [۴]

یوسف علیہ اسلام نے اہل مصر کو حسب طاقت توحید کی طرف دعوت دی لیکن وہ سب اپنے کفر و شرک پر جمے رہے، جس طرح حضرت یوسف کے بعد آل فرعون کے ایک مومن کی بات کو حکایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ ولقد جاءكم يوسف من قبل بالبينات فما زلتم في شك مما جاءكم به حتى اذا هلك قلتم لن يبعث الله من بعده رسولا كذلك يضل الله من هو مسرف مرتاب ﴾

"اور یوسفؑ تمہارے پاس اس سے پہلے واضح دلائل لا چکے ہیں، تم ان کی شریعت کے متعلق بھی شک کرتے رہے، حتیٰ کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم کہنے لگ گئے: اس کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی رسول ہرگز نہیں بھیجے گا، اسی طرح اللہ ایسے شخص کو گمراہ کرتے ہیں جو بے باک اور شک کرنے والا ہو"۔

آل فرعون میں سے ایک مومن نے یہ بات یوسف علیہ السلام کے پانچ سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دفاع کرتے ہوئے دربار فرعون میں اس وقت کی تھی جب لشکر فرعون موسیٰ علیہ اسلام کو قتل کرنے کا ارادہ کر چکا تھا، اور اس سے یہ حقیقت کھل گئی کہ یوسف علیہ السلام کی دعوت سے اہل مصر میں سے کوئی بھی ان پر ایمان نہ لایا۔ لیکن اس سب کے باوجود حضرت یوسف علیہ السلام اقامت عدل و انصاف سے نہ رکے۔ اگرچہ ان کے سسٹم اور ان کی باطل قانون سازی کو بھی کلی طور پر وہ تبدیل نہ کر پائے، جس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کی جو تدبیر کی تھی اس میں وہ اپنے بھائی پر بادشاہ مصر کا قانون نافذ نہ کر سکے بلکہ چور کو اپنا غلام بنا لینے کا جو قانون بنو اسرائیل کا تھا، وہ اس پر عمل در آمد کر کے اپنی تدبیر میں کامیاب ہو سکے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ قال فما جزاوہ ان کنتم کاذبین قالوا جزاوہ من وجد فی رحلہ فھو جزاوہ کذلک نجزی الظالمین ﴾

"بولے! اگر تم جھوٹے نکلے تو اس (چور) کی سزا کیا ہو گی؟ کہنے لگے: اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان میں سے وہ (مسروقہ چیز) بر آمد ہو وہ خود اس کے بدلے میں جائے، اسی طرح ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں" ـــــ اور فرمایا:

﴿ کذلک کدنا لیوسف ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک ﴾

"اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی (کیونکہ) وہ اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون کے مطابق نہیں پکڑ سکتے تھے"۔

اس آیت میں "دین الملک" سے مراد چوروں کے متعلق شہنشاہ مصر کا قانون ہے جو قانون انبیاء کے خلاف تھا۔ اس سب سے معلوم یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام حسب قدرت عدل و احسان کرتے رہے حالانکہ کافرانہ نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔

اور یوسف علیہ السلام نے اہل مصر پر جو جزوی حکمرانی کی، اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا:

"رب قد آتیتنی من الملک و علمتنی من تاویل الاحادیث فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصلحین"

"اے میرے پروردگار! تو نے مجھے کچھ بادشاہت دی اور مجھے باتوں کی کچھ تفسیر سکھلائی، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے، مجھے اسلام کی حالت میں موت دے اور نیکوں کے ساتھ ملا دے"۔

یہ ساری آیات اس بارے میں واضح ہیں کہ کفار میں قیام عدل کا موقع اگر مسلمان کو ملتا ہو تو وہ اسے قطعاً ہاتھ سے نہ جانے دے۔ بلکہ اگر کفار اس کے عدل اور علم کے ضرورت مند ہوں اور وہ ان سے

کنارہ کش ہو تو وہ یقیناً گناہ گار ہو گا۔ یہ تو کافروں کے بارے میں شرعی نقطہ نظر ہے اور اگر مسلمان، اہل دین و تقویٰ کی امارت اور ان کی سربراہی کے محتاج ہوں تو شرعی موقف اس سے بھی زیادہ سخت ہو گا۔

(ب) النجاشی رحمہ اللہ اور حبشہ پر ان کی بادشاہت:

حبشہ کے شہنشاہ نجاشی رحمہ اللہ نبی اکرم ﷺ پر بلاشک وشبہ ایمان لے آئے تھے اور ایمان ہی کی حالت میں فوت ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی تھی اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا تھا۔ صحیح بخاری (حدیث نمبر ۳۸۷۷) میں مروی ہے کہ نجاشی کی موت کے وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

"مات الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمہ"

"آج ایک نیک آدمی فوت ہو گیا ہے، تم اٹھو اور اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ پڑھو"۔

نجاشی اپنے ایمان و اسلام کے باوجود ایسی قوم پر حکمرانی کرتے رہے جو کافر تھی، توحید کی دشمن اور دین اسلام میں داخل ہونے سے منکر تھی۔ وہ اس قوم میں رہ کر عدل و انصاف اور اچھے برتاؤ کی آبیاری کرتے رہے۔ وجود کفر و شرک کے باوجود اس قوم میں ان کا باقی رہنا بلاشبہ بہتر تھا اس لئے کہ اگر کوئی کافر اس ذمہ داری کو سنبھالتا تو وہ اس میں من مانی کرتا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ میدان دعوت الی اللہ میں رسولوں کا طریق کار مصلحتوں کو جمع کرنا اور انہیں مکمل کرنا نیز اپنی استطاعت کے دائرۂ کار میں رہ کر کام کرنا تھا کیونکہ ہر آدمی مکمل عادلانہ نظام قائم کرنے اور اپنے ارادوں کو نہایت کامل طریقے سے سرانجام دینے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے چنانچہ برائیوں کو ممکنہ حد تک کم کرنا اور مصالح کو ممکنہ بڑی حد تک جمع کرنا ہی انبیاء و رسل علیہم السلام کا راستہ تھا (اور اسی منہاج کو حضرت یوسف علیہ السلام اور نجاشی رحمہ اللہ نے اپنایا)

قصۂ نجاشی سے جو چیز زیر بحث موضوع سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پیش نظر ہمیں سنت نبویہ[7] سے واضح دلیل مل جاتی ہے کہ ایک مسلمان کافروں کی قوم میں رہ کر کسی چھوٹے یا بڑے عہدے کا ذمہ دار بن سکتا ہے خواہ وہ قوم اس دوران اپنے کفر و شرک پر جمی رہے۔ اس طرح وہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم کر سکتا اور انہیں توحید کی طرف دعوت دے سکتا ہے گو وہ اس کی صدا پر لبیک نہ بھی کہیں۔

سیرت نبویہ میں موجود ہے کہ نجاشی کے ملک میں جب اصحاب رسول ﷺ (جن کے امیر جعفر بن ابی طالب تھے) پہنچے تو اس نے ان سے بہت اچھا برتاؤ کیا اور انہیں اپنے دین پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں مکمل امن عطا کیا، پھر جب قریش نے نجاشی کو دھوکہ دینے اور اس کے اور مسلمانوں کے درمیان بغض و عناد کی فضا ہموار کرنے کے لیے یہ الزام لگایا کہ مسلمان مریم علیہ السلام کو برا بھلا کہتے ہیں تو عمرو بن العاص

کو تحائف دے کر نجاشی کی طرف روانہ کیا۔ نجاشی نے جعفر بن ابی طالب کو طلب کیا، صحابیؓ مذکور نے سورت مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی تو نجاشی نے ایک لکڑی فضا میں لہرائی اور کہا: "عیسیٰ علیہ السلام اس سے زیادہ تھے نہ کم"۔ یہ بات سن کر نجاشی کے حاشیہ بردار جو حکومت کے وزراء اور مملکت کے لیڈر تھے، ناک بھوں چڑھانے لگے، سو نجاشی نے ان سے کہا: وان نخرتم

"خواہ تم نتھنے پھیلاؤ اور نفرت سے انہیں خاطر میں نہ لاؤ"

ابن کثیرؒ نے "البدایہ والنہایہ" میں مسند احمد سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

"ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کی طرف روانہ کیا، ہم تعداد میں اسی (۸۰) کے قریب تھے جن میں جعفر، عبداللہ بن عرفطہ، عثمان بن مظعون اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

ادھر ہم نجاشی کے ملک میں پہنچے اور دوسری طرف قریش نے عمرو بن العاص اور عمارۃ بن الولید کو بیش قیمت تحفہ جات دے کر بھیج دیا۔ یہ دونوں نجاشی کے دربار میں پہنچتے ہی اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور ازاں بعد اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر کہنے لگے:

"ہمارے کچھ بچازاد (رشتہ دار) لوگ ہم سے اور ہمارے دین سے منہ موڑ کر آپ کی سرزمین پر آئے ہوئے ہیں"۔

نجاشی: وہ اس وقت کہاں ہیں؟

عمرو بن العاص: آپ کے ملک میں موجود ہیں، آپ کسی کو بھیج کر انہیں بلالیں! نجاشی نے انہیں بلوایا تو جعفر بن ابی طالب اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے: "آج تمہاری طرف سے بات چیت میں کروں گا"۔

سب نے موافقت کی تو جعفر دربار نجاشی میں اس طرح آئے کہ سلام کہا اور سجدہ ریز نہ ہوئے، درباریوں کے اعتراض پر کہنے لگے: "ہم صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں"۔

نجاشی: "وہ کیوں"؟

جعفر: "اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسولؐ بھیجا ہے جو ہمیں صرف اللہ کے سامنے جھکنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیتا ہے"۔

عمرو بن العاص: "عیسیٰ بن مریمؑ کے متعلق ان کا موقف آپ کے موقف کے خلاف ہے"۔

چنانچہ نجاشی کے پوچھنے پر جعفرؓ نے کہا:

"ہم ان کے متعلق وہی کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں جسے اس نے کنواری مریم میں پھونکا"۔

نجاشی نے یہ سن کر زمین سے ایک لکڑی اٹھائی اور کہنے لگے: "اے حبشہ کی جماعت اور پادریو!

اللہ کی قسم ہم عیسیٰ کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں یہ اس سے زیادہ ماسوائے اس لکڑی کے کچھ بھی نہیں کہتے"... پھر مسلمانوں سے مخاطب ہوئے اور کہا:

"تمہیں خوش آمدید ہو، میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں، انہی کے متعلق ہمیں انجیل سے خبر ملی ہوئی ہے اور وہی وہ رسول ہیں جن کی عیسیٰ بن مریم نے خوشخبری دی تھی۔ تم جہاں چاہو رہو اور اللہ کی قسم! اگر مجھ پر بادشاہت کا بوجھ نہ ہوتا تو میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاتا اور ان کے جوتے اٹھانے کا شرف حاصل کرتا"۔

پھر نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تحائف واپس لوٹا دینے کا حکم دیا، ابن کثیرؒ یہ قصہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: "اس کی سند عمدہ اور اس کا سیاق و سباق بہت اچھا ہے"۔[8]

اس طویل قصے سے معلوم ہوا کہ نجاشی مسلمان ہو گئے تھے اور اپنے ملک میں اس قوم پر بادشاہت کرتے رہے جس نے ان کے ایمان میں ان کی موافقت نہ کی اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے گریزاں رہے۔

اگر اقتدار میں کفار کے ساتھ مشارکت سے دور رہنا اور اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا ضروری اور شرائط اسلام میں داخل ہوتا تو کافروں پر حکمرانی کرنے والے نجاشی کو حضور ﷺ اس حالت پر برقرار نہ رکھتے، ان کی موت کے بعد انہیں "نیک آدمی" کے وصف سے نہ نوازتے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم نہ دیتے۔

اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بادشاہت پر نجاشی کا باقی رہنا، قوم کو حق پر قائم و دائم رہنے کا حکم دینا اور اس میں حتی الوسع عدل و انصاف کرنا اس سب کو چھوڑ دینے کی بہ نسبت بہتر تھا اور زیر بحث موضوع میں سنت نبویہ سے یہی واضح ترین دلیل ہے۔

باب سوم

ظالمانہ اسلامی حکومتوں میں ذمہ داریاں سنبھالنے کا حکم

اس دیندار مسلمان کے لیے امارت کا قبول کرنا مشروع ہے جو اس کے ذریعے خیر و بھلائی کے کام کرنے کا عزم کر لے، اگرچہ وہ امارت کچھ ظلم و باطل پر مشتمل ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ارتکاب اخف الضررین کا اصول بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کوئی سلطان یا اس کا کوئی ماتحت مثلاً امیر، گورنر اور قاضی وغیرہ جب اپنے واجبات ادا کرنے اور محرمات ترک کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو لیکن اس کے باوجود بھی وہ حسب استطاعت اپنی ذمہ

داری نبھانے کی کوشش اس لیے کرتا ہو کہ کہیں کوئی ایسا شخص ذمہ دار نہ بن جائے جو اختیار و قدرت کے باوجود بھی اپنی ذمہ داری کما حقہ نہ نبھائے تو اس کے لیے یہ سرپرستی اور امارت وغیرہ جائز ہے بلکہ بسا اوقات واجب بھی ہو جاتی ہے، کیونکہ جب یہ ان لازمی امور سے متعلق ہو جن کی مصلحتوں کا حصول ضروری ہوتا ہے مثلاً شعبۂ جہاد کی سرپرستی یا تقسیم مال فئی یا اقامت حدود یا راستوں کی سلامتی کی وزارت ہو تو اسے سنبھالنا واجب ہو جاتا ہے۔

اگر اس وزارت کے سنبھالنے سے کچھ ناجائز کام کرنا پڑتے ہوں مثلاً بعض ایسے آدمیوں کو ذمہ داریاں سونپنا جو ان کے مستحق ہی نہ ہوں، لوگوں سے ایسے محصولات کا مطالبہ کرنا جو سرے سے جائز ہی نہ ہوں اور پھر انہیں ایسے افراد پر تقسیم کرنا جو ان کے حق دار نہ ہوں، ان تمام ناجائز تصرفات کو چھوڑ دینا صاحب امارت کے لیے ناممکن ہو تو یہ اس اصول میں شامل ہو جائیں گے کہ "مالایتم الواجب اوالمستحب الابہ فھو واجب اومستحب" یعنی جس چیز کے بغیر واجب یا مستحب پورا نہ ہو سکتا ہو وہ چیز بھی وجوب یا استحباب کا حکم لے لیتی ہے بشرطیکہ اس چیز کی خرابی واجب یا مستحب کی مصلحت سے کم ہو۔ (سو ان ناجائز تصرفات میں موجود خرابیاں اگر امارت میں موجود باقی مصلحتوں سے کم ہوں تو ان کا کرنا لازمی ہو جائے گا)۔ بلکہ وہ امارت اگر ضروری نہ بھی ہو لیکن ظلم پر مشتمل ہو اور اس کا ذمہ دار اپنے ماتحتوں پر ظلم کرتا بھی ہو، ایسی امارت کا ذمہ دار اگر ایسا شخص بنے جس کا مقصد اس کے ذریعے ظلم کو کم کرنا اور تھوڑا برداشت کر کے زیادہ کو ختم کرنا ہو تو اس حسن نیت کے ساتھ وہ شخص لائق تحسین ہے اور چھوٹی برائی کا ارتکاب کر کے اگر وہ اس سے کہیں زیادہ بڑی برائی کو ختم کر دیتا ہے تو اس کا یہ کردار بہت اچھا ہو گا"[10]

میں کہتا ہوں یہ بالکل درست فقہ ہے، اسلام جھوٹا تقویٰ اور ان عیسائیوں کی رہبانیت نہیں ہے جنہوں نے حکومت کرنے کا اختیار فاسق و فاجر لوگوں کو دے دیا تھا اور خود گرجا گھروں میں بند ہو کر رہ گئے۔

شیخ الاسلام ؒ نے اپنے سابقہ کلام میں یہ ثابت کیا ہے کہ ضروری عدل و انصاف قائم کرنے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود بھی ذمہ داریاں سنبھال لینا جائز بلکہ کبھی واجب بھی ہو جاتا ہے جبکہ ذمہ دار کا ہدف تخفیف ظلم اور ان لوگوں کو عہدوں سے دور رکھنا ہو جو انہیں ظلم و ستم کی سیڑھی سمجھ لیتے ہوں۔ پھر شیخ الاسلام نے بطور دلیل حضرت یوسف علیہ السلام کی وزارت خزانہ کا ذکر کیا ہے اور ان کی نص عبارت سابقہ باب میں گزر چکی ہے۔

ابن تیمیہ ؒ نے یہ شرعی حکم اس فقہی اصول سے اخذ کیا ہے کہ "جب دو حرام کیے گئے کام جمع ہو جائیں اور ان میں سے بڑے کو ترک کرنا چھوٹے کے ارتکاب کے بعد ممکن ہو تو اس چھوٹے حرام کیے گئے کام کا ارتکاب لازمی ہو جاتا ہے اور وہ بایں صورت حقیقت میں حرام نہیں رہتا۔ چنانچہ امارت و سرپرستی کو ظالموں اور فاسقوں کے لیے چھوڑ دینے میں بہت بڑے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تاہم اگر اسے ایسا

دیندار مسلمان سنبھال لے جو اس کے ذریعے تیموں و بتامیٰ کو عام کرنے اور ظلم و فساد کو کم کرنے کا عزم رکھتا ہو تو اس میں نسبتاً کم نقصان کا خطرہ ہوتا ہے لہٰذا اخف الضررین کا ارتکاب ضروری ہو جائے گا۔

شیخ الاسلام کے الفاظ یہ ہیں:

"اور اسی طرح جب ایسے دو حرام کیے گئے کام مجتمع ہو جائیں کہ ان میں سے بڑے کو چھوڑنا تب ممکن ہو جب ان میں سے چھوٹے کا ارتکاب کر لیا جائے تو اس صورت میں چھوٹے کا ارتکاب در حقیقت حرام نہیں ہو گا اور اگر باعتبار اطلاق اس (بڑے) کو ترک واجب اور اس (چھوٹے) کو "فعل محرم" کا نام دے دیا جائے تو یہ ضرر رساں نہیں ہو گا اور ایسی ہی صورت میں کہا جاتا ہے کہ فلاں نے عذر کی بنا پر واجب چھوڑ دیا اور برتر مصلحت یا ضرورت یا بڑے حرام کام کو ختم کرنے کے لیے فعل محرم کا ارتکاب کیا" (۱۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا دور ہمارے اس دور سے بوجوہ مماثلت رکھتا تھا، مثلاً تاتاریوں کے ہاتھوں خلافت عباسیہ کا زوال، چھوٹی ریاستوں اور چھوٹے ملکوں کے حکام کی اپنی اپنی جگہ پر خود مختاری بلکہ چند شہروں اور بستیوں پر مشتمل ملکوں کا قیام، ریاستوں کے حکام پر ظلم اور جہالت کا غلبہ، کبھی اسلام، تو کبھی اپنے خود ساختہ قوانین اور کبھی سابقہ روایات کو قانون کا درجہ دیا اور حکام کا عام مسلمانوں کو چھوڑ کر اپنے لئے اموال جمع کرنا (یاد رہے کہ اس وقت مال کی تقسیم نبی ﷺ اور خلفاء راشدین کے طریقے پر نہیں ہوتی تھی) ـــــ اس ساری صورت حال میں شیخ الاسلام امارت سے دور رہنے کو ناجائز قرار دیتے تھے حتیٰ کہ تب بھی جبکہ ذمہ دار قیام عدل کا فریضہ اس انداز پر انجام نہ دے پائے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔

میں یہاں زیر بحث مضمون کے متعلق شیخ الاسلامؒ سے کیے گئے ایک سوال اور ان کے جواب کو من و عن نقل کرنا چاہتا ہوں:

سوال: ایک شخص کو حکومت کی طرف سے ایک جانب مختلف اموال مثلاً تجارت، کھیتوں اور گھروں پہ لگنے والے محصولات وغیرہ جمع کرنے کا اور دوسری جانب مختلف مدات سے جمع شدہ اموال کو خرچ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ نظام ملوکیت کے معمولات کے مطابق ان محصولات اور دیگر جمع شدہ اموال سے بادشاہ اور اس کے حاشیہ برداروں (کی عیاشی) کے لیے بھی وافر حصہ نکالنا پڑتا ہے حالانکہ ان مالی معاملات کا ذمہ دار حاکم اس ظالمانہ طریقۂ تقسیم مال کو سرے سے ختم کر دینا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں وہ حسب طاقت کوشش بھی کرتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھی جانتا ہے کہ اگر وہ اس ذمہ داری سے دستبردار ہو جائے اور کوئی دوسرا آدمی اس کا ذمہ اٹھا لے تو ظلم بجائے کم ہونے کے زیادہ ہو جائے گا جبکہ وہ خود ظالمانہ محصولاتی نظام میں کسی حد تک بایں طور کمی کر سکتا ہے کہ وہ آدھے محصولات معاف کر دے اور دوسرا

نصف چونکہ حکومتی مصارف میں خرچ ہوتا ہے اور اس سے اس کا جو تقاضا بھی کیا جاتا ہے کہ اسے وہ رد نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ اسے معاف کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ تو کیا ایسے شخص کا اپنی ذمہ داری کو سنبھالے رکھنا جائز ہے جبکہ اس کی نیت عدل اور ظلم ختم کرنے کے سلسلے میں اس کی تگ و دو معروف ہے؟ یا اس ذمہ داری سے ہاتھ کھینچ لینا اس پر ضروری ہے، جبکہ اس کی جگہ پر اگر کوئی اور شخص آ جائے تو نہ صرف ظلم برقرار رہے گا بلکہ بڑھتا چلا جائے گا؟

کیا اس امارت میں اس پر کوئی گناہ ہوگا یا نہیں؟ اور اگر کوئی گناہ نہیں تو جس معاملے میں وہ باوجود کوشش کرنے کے ظلم ختم نہیں کر پاتا، اس کے بارے میں اس سے پوچھ کچھ ہوگی یا نہیں؟

اور یہ کہ ان دو میں سے کونسا کام بہتر ہے! یہ کہ وہ ظلم ختم کرنے یا کسی حد تک کم کرنے کے لیے اپنی کوشش جاری رکھے یا ظلم باقی رہے بلکہ بڑھتا رہے اور وہ خود پیچھے ہٹ جائے؟

اور جب رعایا اس شخص سے حاصل ہونے والے فوائد و منافع کے پیش نظر اسے باقی رکھنا چاہے[۱۲] تو اس کے لیے بہتر کیا ہے؟ یہ کہ وہ رعایا کی موافقت کرے یا دستبردار ہو جائے باوجودیکہ عوام اس حاکم کی دستبرداری کو ناپسند کرتی ہو کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس کے بعد ظلم و ستم میں اضافہ ہو جائے گا؟

جواب: "ہاں! جب ایک حاکم یا اہل کار قیام عدل و انصاف اور رفع ظلم کے لیے حتی الامکان کوشش کرتا ہو اور اس کی سرپرستی کسی دوسرے کی سرپرستی سے مسلمانوں کے حق میں بہتر ہو اور لوگوں کی جاگیروں پر اس کا غلبہ بہ نسبت کسی دوسرے شخص کے غلبے کے زیادہ اچھا ہو جیسا کہ سائل نے ذکر کیا ہے، تو اس عہدہ پر اس کا باقی رہنا جائز ہے اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ اس کا اس ذمہ داری پر برقرار رہنا اس کو چھوڑ دینے سے افضل ہے۔ اس صورت میں کہ اسے چھوڑنے کے بعد وہ اس سے بہتر کسی اور کام میں مشغول نہ ہو سکتا ہو۔[۱۳] بعض اوقات اس کے لیے ایسی ذمہ داری کو سنبھالنا واجب بھی ہو سکتا ہے۔

سو عدل و انصاف کو حسب استطاعت پھیلانا اور ظلم کو حتی الامکان ختم کرنا فرض کفایہ ہے۔ ہر انسان اگر اپنی جگہ کوئی اور شخص نہیں پاتا تو وہ اس فریضے کی انجام دہی کے لیے جتنی طاقت رکھتا ہے اتنا کر گزرے اور جتنا ظلم ختم کرنے سے وہ عاجز رہتا ہے اس کے بارے میں اس سے پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ رہے وہ محصولات جو بادشاہوں نے مقرر کر رکھے ہوتے ہیں اور جنہیں یکسر ختم کرنا ممکن ہوتا ہے تو ان کے متعلق بھی اس سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ اگر بادشاہ اور اس کے حواری (اپنی عیاشی کے لیے) اتنے اموال طلب کرتے ہوں۔[۱۴] جن کی ادائیگی بعض محصولات کو برقرار رکھنے کی صورت میں ہی ہو سکتی ہو عدم ادائیگی کی صورت میں لوگوں کی جاگیروں سے محصولات جمع کرنے کی ذمہ داری ایسے نئے عہدے داروں کے سپرد کیے جانے کا اندیشہ ہو جو ظلم میں کمی کے بجائے اضافہ کر دیں گے تو ایسے بعض محصولات کو وصول کرنا اور

حکام کے سپرد کرنا اس بات کی نسبت بہتر ہوگا کہ تمام کے تمام نصوبات برقرار رہیں۔ جس نے ان محصولات سے عدل و احسان کے پروگراموں میں خرچ کیا، وہ بہرحال کسی دوسرے کے مقابلے میں حق کے زیادہ قریب ہے اور جمع شدہ اموال سے خرچ کرنے کا وہ ذمہ دار جو بھلائی کے کاموں میں زیادہ خرچ کرتا ہے وہ (درحقیقت) مسلمانوں سے اپنی استطاعت کے مطابق ظلم کو کم کرتا اور ان سے بعض محصولات کا مطالبہ کرکے انہیں شرپسندوں کی شرارتوں سے بچاتا ہے۔

لہٰذا جس حد تک اس نے ظلم ختم کیا اس میں وہ مسلمانوں کے ساتھ نیکی کرنے والا ہے نہ کہ ظلم کرنے والا۔ اسے اس کا اجر و ثواب دیا جائے گا اور جو ناجائز محصولات وہ عوام الناس سے (بامر مجبوری) وصول کرتا ہے، ان میں اس کو دنیا و آخرت میں کوئی گناہ نہیں ہوگا اور کوئی تاوان بھی نہیں ہوگا بشرطیکہ وہ عدل و احسان کے لیے حسب امکان کدو کاوش کرتا رہا ہو۔

اس کی مثال یتیم کے سرپرست، وقف شدہ مال کے نگران، مضاربت میں محنت کرنے والے شخص، کاروبار میں شریک آدمی اور دوسرے ان لوگوں کی طرح ہے جو کسی اور شخص کے لیے مالی تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ یتیم کے سرپرست کے لئے اگر ظالم حکام کو یتیم کے مال سے کچھ حصے کی ادائیگی کرکے ہی اس کی مصلحت و خیر خواہی کے لئے کام کرنا ممکن ہو تو وہ اس ادائیگی کے باوجود بھی یتیم کے لیے خیر خواہ ہوگا نہ کہ بدخواہ۔[15] کیونکہ ٹیکس وصول کرنے والوں کو جو ٹیکس[16] اونٹوں، اونٹنیوں اور دوسرے ان اموال پر دیئے جاتے ہیں جن کے وہ ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح زمینوں، دوسری جائیدادوں اور اشیاء خرید و فروخت پر عائد ہونے والے وہ محصولات[16] جو ان کے سپرد کئے جاتے ہیں، ان سب کی ادائیگی فی زمانہ سب پر لازمی ہوتی ہے خواہ کوئی اپنی ذات کے لیے تصرف کرتا ہو یا کسی اور کے لیے۔ چنانچہ دوسرے لوگوں کی مصلحتوں کے لیے اگر اس قسم کے تصرفات (انہی کے اموال سے محصولات وغیرہ کی ادائیگی) کی اجازت نہ ہو تو اس طرح لوگوں کے (باہمی تعلقات) خراب ہو جائیں گے اور ان کی مالی مصلحتیں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔[17]

جو شخص ان محصولات کی ادائیگی سے دوسروں کے لیے تصرف کرنے والے ان ذمہ دار حکام کو اس لیے روکتا ہو کہ تھوڑا سا ظلم بھی واقع نہ ہو (اگرچہ اس کے نتیجے میں اپنے اندر ظلم و فساد کے کئی گنا بڑھ جانے پر لوگ آمادہ بھی ہو جائیں) تو اس کی مثال ایک ایسے تجارتی قافلے کی ہے جو کسی جگہ سے گزر رہا ہو اور ڈاکو اس پر حملہ آور ہو جائیں۔ اگر وہ قافلہ ڈاکوؤں کو اپنا کچھ مال نہیں دیتا تو وہ اس کا سارا مال لوٹنے اور اس میں شامل تمام افراد کو قتل کرنے پر تل جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس قافلے سے یہ کہے کہ لوگوں کے اموال میں سے ایک پیسہ بھی ان ڈاکوؤں کے سپرد کرنا تمہارے لیے جائز نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا

کہ وہ یہ مشورہ دے کہ دراصل اس تھوڑے سے مال کی حفاظت کرنا چاہتا ہے جس قدر کہ مطالبہ کر رہے ہیں اور اسے انہیں دینے سے منع کر رہا ہے اور اس کے پیش نظر وہ زیادہ مال نہیں جو تھوڑے مال کے بدلے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا اگر وہ قافلہ اس آدمی کا یہ مشورہ مان کر ڈاکوؤں کو کچھ بھی نہ دے تو نتیجتاً تھوڑا ہی نہیں سارا مال ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا، وہ اپنی جانیں بھی کھو بیٹھیں گے۔ تو اس طرح کا مشورہ کوئی عقلمند آدمی نہیں دے سکتا، (۹) چہ جائیکہ کوئی شریعت ایسا حکم لائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو لوگوں کی بھلائی حاصل کرنے، پھر اسے مکمل کرنے اور مفاسد کو حتی الامکان ختم کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ (نہ کہ شر و فساد کو بڑھانے کے لیے)۔ چنانچہ مالی معاملات کا یہ ذمہ دار اپنی ذمہ داری پر برقرار رہتے ہوئے بعض باطل محصولات وصول کر کے اور انہیں حکام پر خرچ کر کے اگر مسلمانوں سے ظلم اور شر و فساد کو اپنی استطاعت کے مطابق ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر وہ اس ذمہ داری سے دستبردار ہو گیا تو ظلم میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، تو ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں اور نہ ہی دنیا و آخرت میں کوئی پرسش ہے۔ اس کی امارت و سرپرستی جائز ہے بلکہ بسا اوقات واجب بھی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح بعض مالی معاملات کا وہ فوجی عہدے دار جس سے گھوڑوں، اسلحہ جات اور فوجیوں کے اخراجات کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اگر وہ بعض محصولات وصول نہیں کرتا تو ان مطالبات کو پورا نہیں کر سکتا جبکہ میدان جہاد میں مسلمانوں کو وہ تبھی فائدہ پہنچا سکتا ہے جب وہ ان محصولات کو برقرار رکھے۔ ایسے عہدے دار کو اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ تم چونکہ محصولات کی وصولی کے بغیر فوجی مطالبات پورے نہیں کر سکتے اور ان محصولات کی وصولی چونکہ شرعاً ناجائز ہے لہٰذا اس ذمہ داری سے تم اپنے آپ کو الگ کر لو، اور وہ اس کے مشورے پر الگ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ پر ایسا شخص آتا ہے جو مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے تو اس طرح کا مشورہ دینے والا آدمی غلطی پر اور حقائق دین سے ناواقف ہے کیونکہ وہ ترک اور عرب فوجی جو مسلمانوں کے لیے زیادہ نفع بخش اور کم ظالم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داری میں عدل و انصاف کے زیادہ قریب ہیں، وہ بہر حال بہتر ہیں کہ بجائے ان کے مالی ذمہ داریوں کو ایسے لوگ سنبھال لیں جو مسلمانوں کو فائدہ کم دیں اور ان پر ظلم زیادہ کریں۔

مالی معاملات کے تمام ذمہ داروں میں سے جو بھی اپنی فرصت کے مطابق قیام عدل و انصاف اور لوگوں سے خیر خواہی کے لیے کوشش کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اس کے کیے ہوئے نیک کاموں کا اجر و ثواب دیں گے اور جس چیز سے وہ عاجز ہے اس پر اسے سزا نہیں دیں گے۔ اسی طرح جو ناجائز تصرفات اسے بامر مجبوری کرنا پڑے ہوں ان پر اس کا مواخذہ نہیں ہو گا اس صورت میں کہ ان ذمہ داریوں کو چھوڑ دینے سے

زیادہ بڑے شر و فساد کا برپا ہونا یقینی ہو، واللہ اعلم" [19]

شیخ الاسلامؒ کے اس فتوے پر میں اور تو کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا، صرف یہ دعا کر سکتا ہوں کہ اے شیخ الاسلامؒ! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی رحمت سے نوازے اور رہتی دنیا تک آپ کے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا رہے!!

باب چہارم

پارلیمنٹ کی رکنیت کے بارے میں بعض ہم عصر علماء کی آراء

مروجہ طریقۂ انتخاب کے ذریعے پارلیمنٹ کا ممبر بننے اور سرکاری عہدوں کی ذمہ داری سنبھالنے کی مشروعیت کے بہت سے ہم عصر سلفی علماء قائل ہیں۔ ان میں فضیلۃ الشیخین / عبدالعزیز بن باز اور محمد صالح العثیمین سرفہرست ہیں، جنہوں نے امت مسلمہ اور اسلامی ممالک (جو خود ساختہ جمہوری قوانین و دساتیر کی آزمائش میں مبتلا ہیں) کی موجودہ صورتحال سے ناواقفیت اور اس کے متعلق عدم بصیرت کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا مکمل ادراک کر کے جواز کے فتوے دیئے ہیں۔

(ان دونوں مشائخ کے فتووں کا بعد میں ذکر کیا جائے گا، پہلے ملاحظہ کیجئے:

(۱) شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر سعدی رحمہ اللہ (م ۱۳۷۶ھ) کی رائے

مرحوم جو اپنے زمانے میں اہل نجد کے امام تھے اپنی تفسیر تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان میں جب اللہ تعالیٰ کے اس کے فرمان

﴿ قالوا یا شعیب ما نفقه کثیرا مما تقول وانا لنراک فینا ضعیفا ولولا رهطک لرجمنک وما انت علینا بعزیز ﴾

"بولے: اے شعیب! تو جو کچھ کہتا ہے اس سے بہت ساری باتیں ہم نہیں سمجھتے، ہم تو تجھے اپنے درمیان کمزور خیال کرتے ہیں، اگر تیرا قبیلہ (جو تیرے لیے ڈھال بن جاتا ہے) نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر ڈالتے اور ہماری نگاہ میں تمہاری کچھ عزت نہیں"۔

—— پر پہنچے تو اس سے حاصل ہونے والے فوائد ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس آیت کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا دفاع بہت سارے اسباب و ذرائع سے کرتا ہے۔ وہ کبھی کبھار ان میں سے بعض اسباب کو جان لیتے ہیں اور کبھی کچھ بھی نہیں جان پاتے اور بسا اوقات ان کا دفاع انہیں کے اپنے قبیلے یا وطن کے کافروں کے ذریعے بھی کرتا

ہے، جس طرح حضرت شعیب علیہ اسلام کا دفاع اللہ تعالیٰ نے انہی کے قبیلے کے ذریعے کیا[۲۰] (حالانکہ وہ کافروں کے ساتھ تھا)۔ اسی طرح اس کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ یہ واسطے اور تعلقات و روابط جن سے اسلام اور مسلمانوں کا دفاع ہوتا ہو انہیں حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ بسا اوقات یہ کام واجب ہو جاتا ہے کیونکہ حسب قدرت و امکان اصلاح احوال بہرحال شرعاً مطلوب ہے۔

بنابریں وہ مسلمان جو کافرانہ سٹیٹ میں مقیم ہوں، اگر وہ اس سٹیٹ کو جمہوری ملک میں تبدیل کرنے کے لیے کوششیں کریں تاکہ تمام لوگ اپنے دینی و دنیاوی حقوق حاصل کر سکیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ ایسی حکومت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں جو ان کے دینی و دنیاوی حقوق پامال کرے، ان کی بیخ کنی کرنے پر تل جائے اور انہیں اپنے نوکر بنا لے۔ ہاں اگر یہ ممکن ہو کہ وہ مکمل اسلامی ملک بن جائے اور مسلمان ہی اس میں حکمران ہوں تو پھر یہی واجب ہو گا، لیکن اگر یہ مرتبہ ممکن نہ ہو تو پہلا مرتبہ مقدم ہو گا جس میں کم از کم دین و دنیا دونوں کا دفاع ہو سکتا ہے"[۲۱]

دیکھا آپ نے کہ اس فتوے اور آیت کریمہ سے اس استنباط کا دارومدار "ارتکاب اخف الضررین" کے معروف فقہی اصول پر ہے!!

لہٰذا کافروں کے ساتھ حکومت میں شراکت کے لیے مسلمانوں کی دوڑ دھوپ اگر اس لیے ہو کہ وہ اس کے ذریعے اپنی عزتوں، اپنے مالوں اور دین اسلام کی حفاظت کر سکیں تو یہ بلاشک ان کافروں کے ماتحت رہ کر زندگی بسر کرنے سے بہتر ہے جو ان کے دینی و دنیاوی حقوق تلف کریں۔ اور یہی طرز استدلال اور فقہ مسائل ہے جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اختیار کیا، جس کا ہم گزشتہ باب میں تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں۔ انہوں نے اسی اصول کے پیش نظر فتویٰ بھی دیا اور (حقیقت یہ ہے) کہ اسے چھوڑ کر دوسرے کسی خود ساختہ اصول کو اپنانا جائز بھی نہیں، چنانچہ مسلمان کو اگر دو خرابیوں میں سے ایک کا اختیار دیا جائے تو وہ ان میں سے نسبتاً ہلکی خرابی کو چنے تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ ساری خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی توفیق دیں اور اقتدار محض مسلمانوں کے پاس رہ جائے اور ان کے ساتھ کوئی کافر شریک اقتدار نہ ہو۔

(۲) فضیلۃ الشیخ عبد العزیز بن باز حفظہ اللہ کا موقف

علامہ عبد الرحمٰن بن ناصر سعدی رحمہ اللہ کا جو موقف ہم نے نقل کیا ہے، بالکل وہی موقف شیخ ابن باز حفظہ اللہ نے بہت سی جگہوں پر اور اپنے دوستوں کے سامنے اختیار کیا ہے کہ جو تواتر کی حد تک پہنچتے ہیں، شیخ کا کہنا ہے: "حق کو حق ثابت کرنے اور اللہ کی طرف دعوت دینے کی غرض سے پارلیمنٹ کا ممبر بننا مشروع ہے"۔

تقریباً انہیں الفاظ میں بہت سے سائلوں نے آپ کا فتویٰ نوٹ کیا ہے۔اور شیخ مناع القطان نے اپنی کتاب "معوقات تطبیق الشریعۃ الاسلامیۃ" (ص ۱۶۶) سے شیخ حفظہ اللہ کا مطبوع فتویٰ نقل کیا ہے جو سائل کے اس سوال کے جواب میں ہے کہ کیا قومی اسمبلی کے لیے امیدوار بننا شرعاً جائز ہے؟ اور اسمبلی میں پہنچنے کے لیے دین دار داعیوں کو چننے کی نیت سے ووٹنگ کے متعلق اسلام کا حکم کیا ہے؟

شیخ حفظہ اللہ کے فتوے کی عبارت درج ذیل ہے:

"رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی" لہٰذا قومی اسمبلی میں جانے کا مقصد اگر تائید حق اور انکار باطل ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کے ذریعے داعیان الی اللہ کے ساتھ وابستگی اور امداد حق ممکن ہو سکتی ہے، اسی طرح اس ووٹنگ میں بھی کوئی حرج نہیں ہے جس سے نیک داعیوں کے انتخاب اور حق واہل حق کی تائید وحمایت ہوتی ہو"۔

شیخ نے اپنے اس فتوے میں چند باتوں کو مدنظر رکھا ہے:

اولاً: ممبر بننے والے کی نیت تائید حق اور انکار باطل کی ہو۔

ثانیاً: قومی اسمبلی کی رکنیت حق کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہو اس سے داعیان اسلام کے ساتھ مشارکت اور ان کی مدد ہو سکتی ہو۔

آپ اگر یہ دونوں باتیں شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر سعدیؒ کی رائے کے ساتھ شامل کر دیں تو مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ان اسمبلیوں کی رکنیت برائی کو کم کرنے اور حق کو تقویت پہنچانے کا باعث بنتی ہے۔

(۳) شیخ محمد صالح العثیمین حفظہ اللہ کا نظریہ

نمائندہ اسمبلیوں کے لیے امیدوار بننے کے متعلق بہت سارے طالب علموں نے موصوف سے سوالات کئے تو ان کے سامنے انہوں نے جواز کا فتویٰ دیا حالانکہ بعض نے تو ان اسمبلیوں کے حالات، ان دساتیر کی حقیقت جو دراصل حاکم ہوتے ہیں اور (پارلیمنٹ سے) قراردادیں پاس کرنے کی کیفیت کو شیخ حفظہ اللہ کے سامنے کھول کر بیان بھی کیا تو بھی آپ کا کہنا تھا:

"ادخلوا، اتترکونها للعلمانيين والفسقة؟"

یعنی "تم اسمبلیوں میں داخل ہو جاؤ، کیا تم انہیں لادین اور فاسق لوگوں کے لیے چھوڑ دو گے؟"

اس سے شیخ کا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان اسمبلیوں میں نہ جانے سے جو خرابی پیدا ہو گی وہ نسبتاً اس خرابی سے بہت بڑی ہو گی جو ان میں جانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اب مسئلہ بالکل واضح ہو چکا اور یہ بات کھل کر سامنے آ چکی کہ قانون ساز اسمبلیوں کی رکنیت اور عام سرکاری عہدوں کی ذمہ داری سنبھالنے کی مشروعیت کا موقف دعوت سلفیہ کے ائمہ، ان کے لیڈروں اور علماء امت کے اہل فکر و نظر کا مشترکہ موقف ہے۔ (۲۲)

(۴) فضیلة الشیخ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ کا نقطہ نظر

نمائندہ اسمبلیوں کی رکنیت کا امیدوار بننے کے عدم جواز پر شیخ حفظہ اللہ کا نقطہ نظر مشہور ہے موصوف اس کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ موجودہ اسمبلیاں بغیر ماانزل اللہ قانون سازی کرتی ہیں، باوجود اس کے کہ دستور میں یہ لکھا ہوا بھی ہو کہ ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ دوسری علت یہ کہ رکن اسمبلی اپنے دین کے معاملے میں کسی آزمائش کا شکار اور حق سے دستبردار ہو سکتا ہے!!

لیکن ان کا یہ موقف رکنیت پارلیمنٹ کی حرمت کے باب سے ہے اور نہ اس باب سے کہ رکن اسمبلی کافر یا گمراہ ہو جاتا ہے بلکہ یوں مناسب ہو گا کہ ان کا یہ موقف خلاف اولیٰ کے باب سے ہے۔ اس کی دلیل شیخ حفظہ اللہ کا یہ کہنا ہے کہ "مسلمان عوام کو صرف (دیندار) مسلمان نمائندے ہی منتخب کرتے چاہئیں جبکہ امیدواروں میں اسلام دشمن بھی شامل ہوں"۔

اور الجزائری نجات دہندہ فرنٹ (Salvation Front) کی جانب سے پیش کردہ سوالوں کے جواب میں شیخ کے الفاظ یہ ہیں:

> "میں نہیں سمجھتا کہ مسلم عوام کو ووٹنگ سے باز رہنا چاہئے جبکہ امیدواروں میں اسلام دشمن بھی ہوں اور مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے دیندار بھی ہوں۔ ایسی صورت حال میں ہر مسلمان کے لیے ہماری نصیحت یہ ہے کہ وہ صرف دینداروں اور ان لوگوں کو منتخب کرے جو صحیح راستے کے زیادہ قریب ہوں۔ میں یہ سب اپنے سابقہ نظریے کے باوجود کہہ رہا ہوں کہ شر کم کرنے یا چھوٹی خرابی کے ارتکاب کے ذریعے بڑی خرابی دور کرنے سے جو مقصد ہے وہ موجودہ طریقہ انتخاب کے ذریعے پورا نہیں ہو سکتا" (۲۳)

باب پنجم

سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کی حرمت کا قائل کون ہے؟

"موجودہ قوانین و دساتیر کے تحت وجود میں آنے والی آئین ساز اسمبلیوں کی رکنیت اور دیگر عام ذمہ داریاں (مثلاً وزارت وغیرہ) سنبھالنا حرام ہے" اس موقف کے باطل ہونے پر یہی دلیل کافی ہے کہ اسے سب سے پہلے اہل غلو (حد سے تجاوز کرنے والوں) اور ان جماعتوں نے اختیار کیا ہے جو معاشرے کو

بیک زبان و قلم کافر قرار دیتی ہیں، پھر انہی کی باتوں سے دھوکہ کھانے والے دوسرے لوگوں میں بھی یہی نقطہ نظر پھیلتا چلا گیا ہے۔

میرے خیال میں شکری مصطفیٰ کی جماعت وہ سب سے پہلی جماعت ہے جس نے یہ رائے اپنائی اس عقیدے کی بنا پر کہ پورا معاشرہ اور سارے حکام کافر ہیں، یہ جماعت اس حد تک آگے چلی گئی ہے کہ موجودہ حکومتوں کے زیر سایہ رہ کر امامت نماز تک اس کے نزدیک جائز نہیں۔ اس کا ایک ترجمان کہتا ہے:

"جاہلیت کے اس معاشرے میں رہتے ہوئے ضروری ہے کہ تمام خدمات چاہے جائز ہوں یا حرام بالآخر ایک ہی میدان عمل میں بروئے کار لائی جائیں اور وہ ہے اس کافر معاشرے کی از سر نو تعمیر و خدمت کا میدان" (۲۴)

بلکہ شکری مصطفیٰ کچھ ملازمتوں اور آسامیوں کا ذکر کرنے کے بعد انتہائی مبالغہ آمیز لہجے میں کہتا ہے:

"یہ سارا کچھ شیطان کا اقتدار، اس کا حلقہ اختیار اور اس کی الوہیت کا میٹریل ہے اور اس کے نظام حکومت میں اس کے ساتھ جو لوگ شامل ہیں وہ اسکے غلام اور اس کے محراب کے مجاور ہیں اور وہ سارا کچھ جس کا ہم نے ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ راستے میں پڑا ہوا کوڑا کرکٹ جسے شیطان کے ملک میں بلدیہ کے حکم سے اٹھایا جاتا ہے، وہ بھی اس کی خدائی میں داخل ہے" (۲۵)

انہی غالیوں کی موافقت ہمارے بعض سلفی بھائیوں نے بھی کی ہے اور افسوس ہے کہ ان کے دلائل ان اہل غلو کے دلائل کے قریب ہیں۔

باب ششم

اس راستے کے تمام متبادل ناقص ہیں

ایسے تمام ممالک جہاں کوئی اسلام پسند اور متشرع آدمی وزارت یا اسمبلی میں پہنچا ہے وہاں الحمد للہ جزوی اصلاح کا کام ضرور ہوا ہے۔ امت مسلمہ کے حالات پر نظر رکھنے والا ہر شخص یقیناً اس حقیقت سے آشنا ہے۔

زوال خلافت اسلامیہ کے بعد ترکی میں اسلام کے پھلنے پھولنے کا سب سے بڑا دور وہ ہے جس میں (دیندار) مسلمان، حکومت اور پارلیمنٹ میں داخل ہوئے۔ اسی عرصے میں کئی ایسی قراردادیں پاس کی گئیں جو اسلام کی جانب ترکی کی جدوجہد، مہم اور رفتار کار میں آج تک موثر کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہی حال مصر اور الجزائر کا ہے، دائرہ اسلام کا وسیع ہونا اور کثرت سے لوگوں کا اسلام میں داخل ہونے کی وجہ انتخابی مہم میں

مسلمانوں کی شمولیت، سیاسی مقابلے میں اتر کر لوگوں کے سامنے اسلامی آئین پیش کرنے اور جمہور مسلمانوں کے ساتھ روابط بڑھانے کے ساتھ ساتھ وضاحت سے اپنا پروگرام جو دوسروں سے ممتاز ہے کو پیش کیا گیا۔ یہی حال پاکستان کا ہے، رہا کویت تو وہ اپنی صورت حال سے اس بات کی نمایاں مثال پیش کرتا ہے کہ رکنیت پارلیمنٹ اور وزارت وغیرہ سنبھالنے سے بہت بڑے دعوتی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور فساد و لادینیت کی برائیاں کافی حد تک کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اب موقع نہیں ہے کہ ان شرعی مصلحتوں کو گنا جائے جو اس سے عملاً ہمارے سامنے آئی ہیں اور الحمدللہ سب کو معلوم ہیں۔

یہاں تو ہمارا مقصد اتنا ہے کہ پارلیمنٹ کا ممبر بننے اور سرکاری عہدوں کی ذمہ داری قبول کرنے کے جتنے متبادل موجودہ صورت حال میں ہو سکتے ہیں، ان میں موجود بعض خرابیوں کی نشاندہی کر دی جائے۔

ہم نے مقدمے میں ذکر کیا تھا کہ داعیان اسلام کے چار رجحانات اس وقت میدان دعوت میں موجود ہیں۔ چنانچہ دعوت جہاد دینے والے اس اعتقاد کے ساتھ چل رہے ہیں کہ حکام کافر یا کم از کم ظالم ہیں لہٰذا انہیں اور ان کے لیے ڈھال بننے والے ان کے حواریوں کو قوت سے معزول کرنا واجب ہے ----- اس رجحان کی خرابی ہر صاحب بصیرت جانتا ہے کہ اس طرح قتال ایک فتنہ بن جائے گا۔ مسلمان خود مسلمان کی گولی سے قتل ہونے لگے گا اور ان تشدد پسندانہ کاروائیوں کو بہانہ بنا کر ظالم حکام خود اسلام کو جڑ سے اکھیڑ دینے پر تل جائیں گے۔

دوسرا متبادل علیحدگی اختیار کرنے، مسلمانوں کے معاملات ظالموں اور فسادیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے، آسمان سے کسی معجزے کا انتظار کرنے اور بغیر جہاد کئے اور ممکنہ ذرائع کو بروئے کار لائے کسی اچھی تبدیلی کی امید رکھنے کا ہے۔ یہ بھی دین اسلام کے منافی اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے خلاف ہے:

﴿ ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیروا مابانفسہم ﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتے جب تک وہ خود اپنے دلوں کی حالت کو نہیں بدلتی"۔

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اہل اور لائق لوگوں تک امانت (ذمہ داری) کے پہنچانے اور نااہل کافروں اور گمراہوں سے لے واپس لینے کا حکم دیا ہے اور کافروں کے کلمے کو پست کرنے اور اللہ کے کلمے کو بلند و بالا کرنے کے لیے جہاد واجب کیا ہے۔ لہٰذا موجودہ صورتحال میں علیحدگی اختیار کرنا بڑے گناہوں میں سے ایک گناہ ہے کیونکہ اس سے جہاد واجب اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑ دینا، باطل کو برقرار رکھنا، علم چھپانا اور مسلمانوں کے معاملات کو فسادیوں، ظالموں اور مقتدر چوروں کے سپرد کر دینا لازم آتا ہے۔ سو اس ساری صورت حال میں خاموش رہنا بڑا گناہ اور فساد کبیر نہ ہو تو کیا ہو گا؟

باب ہفتم

قانون ساز اسمبلیوں کی رکنیت اور دیگر ذمہ داریوں سے روکنے والے کس سے تعاون کرتے ہیں؟

ایسے لوگ جو نمائندہ اسمبلیوں کی رکنیت اور سرکاری عہدوں کی ذمہ داریوں سے روکتے ہیں وہ درحقیقت مفسدین کی سب سے بڑی خدمت سرانجام دیتے اور ان کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ شرپسند لوگ تو یہی چاہتے اور عملاً اسی کے لیے تگ و دو کرتے رہتے ہیں کہ وہ داعیان اسلام پر پارلیمنٹ کے تمام دروازے بند کر دیں تاکہ وہ انہیں لوگوں سے الگ تھلگ رکھیں، ان کی دعوت کو دفن اور ان کے مشن کو سرے سے ختم کر دیں۔ (ستم بالائے ستم یہ ہے کہ) بعض عرب ممالک نے جو جھوٹے جمہوری نظام عملاً نافذ کئے ہوئے ہیں، ایسے قوانین وضع کر لیے ہیں جن سے دیندار مسلمانوں کو آئین ساز اسمبلیوں کی رکنیت سے محروم رکھنا مقصود ہے۔ مثلاً دینی بنیاد پر سیاسی جماعت وجود میں لانے کی ممانعت، امیدواروں کے نام جنرل سراغ رسانی کے محکمہ میں لازماً پیش کرنا، آزادانہ اور خود مختارانہ انداز سے انتخابی میدان میں اترنے کی بندش اور اسی طرح کے دیگر وہ قوانین، جن کا آخری نتیجہ دیندار آدمی کو آئین ساز اسمبلی کی رکنیت سے روکنا ہے تاکہ وہ کسی معاملے میں ان کی تردید اور کسی باطل پر ان کی مخالفت نہ کر سکے اور نیز وہ اکیلے لوگوں پر حکمرانی اور اقتدار کے مالک بن کر مسلمانوں کی عزتوں، جانوں اور مالوں کے بارے میں اپنے باطل قوانین بروئے کار لاسکیں!!

لہٰذا آئین ساز اسمبلیوں کی رکنیت کو حرام کہنے والے ذرا غور کریں کہ انہوں نے اپنے اور امت مسلمہ کے متعلق کہیں وہ کردار تو ادا نہیں کیا جس کی تمنا خود ان کے اور امت کے دشمن کرتے ہیں!!

باب ہشتم

اسمبلی کی رکنیت کو حرام کہنے والوں کے دلائل اور ان کی تردید

زیر بحث مسئلے میں ایسے شرعی احکام بیان کر دینے کے بعد جنہیں قرآن و سنت اور بعض اسلاف امت کے اقوال کی تائید حاصل تھی اب ہم ان شبہات کی طرف آتے ہیں جو اس موضوع کے متعلق عموماً پھیلائے جاتے ہیں۔

(ا) جمہوریت کفر ہے

کہتے ہیں "نظام جمہوریت کفر ہے، سو اس میں داخل ہونا اور اس کی اصلاح، اسی میں داخل ہو کر

کرنا بھی ناجائز بلکہ حرام ہے"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس نظام کے کافرانہ ہونے اور بحالت مجبوری و خواہی یا نخواہی اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے اور اسے بروئے عمل لانے والوں کے کافر ہو جانے میں فرق کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ مسلمان تب تک کافر نہیں ہوتا جب تک وہ کفر کا اقرار نہ کرے اور کافرانہ عقیدہ نہ رکھے۔ جب وہ اسے ناپسند کرتا ہو تو اس نے اپنا ایمان محفوظ کر لیا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

فمن انکر فقد بری ومن کرہ فقد اسلم الا من رضی وتابع

"جس نے (شرعی احکام کو تبدیل کرنے والے حکام کی) مخالفت کی وہ (کفر) سے بری ہو گیا اور جس نے انہیں ناپسند کیا وہ بھی چھٹکارا پا گیا سوائے اس شخص کے جس نے (ان کی کافرانہ حرکتوں کو) پسند کیا اور ان کی پیروی کی (وہ ان کے کفر میں شامل ہو گیا)۔

لہٰذا تغیر احکام الٰہی ناپسندیدگی ظاہر کرنے، قیام عدل، رفع ظلم، انکار منکر اور رفع شر کا پختہ عزم کرنے والا شخص اگر موجودہ قوانین کی تابع آئین ساز اسمبلی کا رکن بنتا یا سرکاری عہدوں کی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے تو وہ اپنی نیت کے مطابق عند اللہ ماجور ہے۔

(۲) اس میں کفار کی اطاعت ہے

دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ قانون ساز اسمبلیوں کی رکنیت کافروں کے سامنے جھکنے اور ان کا فرمانبردار بن جانے کے مترادف ہے حالانکہ شرعاً ہمیں ان کی مخالفت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ (دین دار) مسلمان پارلیمنٹ میں اس لیے داخل ہوتا ہے کہ کفار و منافقین کی ناحق قانون سازی میں وہ ان کی مخالفت کرے، بھلائی و خیر اور عدل و انصاف کی قانون سازی کو بروئے عمل لائے اور ظلم و باطل کی تردید کرے یا کم از کم اہل باطل کو روک ٹوک سکے۔

(۳) بے ہودہ محفلوں میں بیٹھنا منع ہے

تیسری دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی مجالس میں بیٹھنے سے منع کیا ہے جن میں کفار احکامات الٰہی کا ٹھٹھہ اڑاتے اور اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑتے ہوں، ارشاد باری ہے:

﴿ واذا رایت الذین یخوضون فی آیاتنا فاعرض عنهم ﴾

"اور جب آپ ایسے لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں جھگڑ رہے ہوں، ان سے آپ کنارہ کشی اختیار کر لیں"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس شخص کے متعلق ہے جو کفار کی مجالس میں بیٹھ کر باطل کا اقرار کرے، اللہ کی آیات میں جھگڑنے والوں کی ہاں میں ہاں ملائے اور ان کے خلاف زبان استعمال نہ کرے۔ رہا

دین دار رکن پارلیمنٹ تو اس کا مشن ہی یہ ہے کہ وہ حسب استطاعت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے، ناحق پر اعتراض کرے، وزراء اور انتظامی مشینری کے ارکان کا محاسبہ کرے۔

(۴) خرابیاں بہ نسبت مصلحت کے زیادہ اہم ہیں

کہا جاتا ہے کہ رکنیت پارلیمنٹ میں جو خرابیاں ہیں وہ بہ نسبت اس کی مصلحت کے زیادہ بڑی ہیں، چنانچہ بعض دوستوں نے جمہوریت کے نقصانات اور اس کی خرابیوں کو گننا شروع کیا تو انہیں پچاس تک پہنچا دیا اور ہم اگر چاہیں تو ان پر مزید پچاس بلکہ سو کا اضافہ کر دیں۔ لیکن اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ رکنیت پارلیمنٹ حرام ہے کیونکہ رکن اسمبلی بننے والا (دیندار) شخص اس نظام کے فاسد ہونے پر ایمان رکھتا ہے اور اسے سرے سے تبدیل کرنے یا کم از کم اس کی خرابیوں اور اس کے نام سے مسلمان قوموں پر حکمرانی کرنے والوں کے تسلط کو حتی الامکان ختم کرنے اور ان لوگوں کو منظر سے ہٹانے کے لیے پارلیمنٹ میں داخل ہوتا ہے جو سرکاری عہدوں کا ہار گلے میں ڈال کر مسلمانوں کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت لادین اور اہل شہوات میں سے ہیں اور قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنا یہ تسلط (دیندار) جمہور مسلمانوں کو انتخابی میدان سے الگ تھلگ رکھ کر اور سیاسی اکھاڑا اپنے لیے خالی کر کے ہی قائم کرتے ہیں تاکہ امت مسلمہ کی تمناؤں کو پامال کریں، اقتدار کی پتوار (*Rudder / gear Helm / Steering*) اور ان کی ہمتوں کو اپنے قابو میں رکھیں اور اس کے بعد ان کی عزتوں، جانوں اور ان کے دین کے تقدس کو روند ڈالیں۔

(۵) جمہوریت کے ذریعے دیندار کبھی اقتدار تک نہیں پہنچے

پانچویں دلیل کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام پسند کسی بھی ملک میں نظام جمہوریت کے ذریعے حکومت تک نہیں پہنچ پائے بلکہ ہوا یہ کہ سیکولر طاقتوں نے ان کا راستہ روکا اور اگر وہ اقتدار کے قریب پہنچے بھی تو انہیں جبراً دور کر دیا گیا۔

اس گھسی پٹی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہی جمہوری نظام ہے جس نے پہلے تو اسلام پسندوں کے لیے اپنے عقائد کی نشر و اشاعت کرنے، عام لوگوں کو اپنی صفوں میں ملانے اور اپنے دشمنوں کو رسوا کرنے اور ان کے مکر و فریب کو بیان کرنے کے واسطے راستہ ہموار کیا۔ اگر اور کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ ہو، صرف یہی ہو تو یہ بھی کافی ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ پھر صرف اتنا نہیں بلکہ وہ دین دار لوگ جو کسی بھی ملک کی پارلیمنٹ میں داخل ہوئے انہوں نے اس کے ذریعے کئی اچھے نتائج اور شرعی مصلحتوں کو ثابت کر دکھایا۔ کم سے کم یہ کہ انہوں نے اللہ کی حجت قائم کی اور ایسے طریقے سے حق کو کھول کر بیان کیا کہ جسے تمام لوگوں حتی کہ اہل باطل نے بھی پسند کیا۔ سو یہ از خود ایک انتہائی اعلیٰ ہدف ہے (جس طرح بنو

اسرائیل کی ایک جماعت نے دوسری جماعت سے کہا تھا: تم ایسی قوم کو وعظ و نصیحت کیوں کرتے ہو جسے اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے یا سخت عذاب دینے والا ہے؟ تو اس نے جواباً کہا تھا:)

﴿ معذرۃ الی ربکم ولعلھم یتقون ﴾ "تمہارے رب کے سامنے الزام اتارنے کی غرض سے اور شاید وہ خدا سے ڈر جائیں" ــــــ (تو اس طرح اہل کفر و گمراہی اللہ تعالیٰ کے سامنے حجت بازی نہیں کر پائیں گے کیونکہ دنیا میں دینداروں نے ان تک اللہ کا پیغام پہنچادیا تھا۔)

نیز اسلام پسندوں نے تقلیل شر اور تکثیر خیر کا کام بھی کیا، اس کے لیے ایک دلیل کافی ہے کہ کویت کی قومی اسمبلی نے "حرمت شراب" کی ایک قرارداد پاس کی جس نے ملک کو "ام الخبائث" سے اور نوجوانوں کو بہت بڑے شر سے بچالیا---- اگرچہ مفسدین نے قومی اسمبلی سے کسی اور قانون سازی کے ذریعے یہ قانون توڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ گو یہ ایک جزوی خیر ہے لیکن انجام کے اعتبار سے بہتر ہے، اس لیے کہ اس سے شر اور بے حیائی کے فروغ کو روکنے میں مدد ملے گی۔

رہی یہ بات کہ جمہوری راستے پر چلتے ہوئے شاید شریعت کا مکمل نفاذ دین دار طبقے کے لیے ممکن نہ ہو تو اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ سفر بہت طویل ہے اور لادین لوگوں اور اسلام کے داخلی و خارجی دشمنوں کے خلاف جہاد بہت کٹھن ہے (لہٰذا حسب امکان اپنا دعوتی کام بہرطور انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے)

یہ بات سب جانتے ہیں کہ جزائری اسلامک فرنٹ اور الجزائر کا اقتدار سنبھالنے اور شریعت اسلامیہ کے عملی نفاذ کے درمیان جو فرمان حائل ہوا وہ ایک بیرونی (فرانسیسی) فرمان تھا جس نے جزائری فوج کو ایکشن میں آنے کا اشارہ دیا۔ ایسی فوج کہ جس کی تربیت سامراجی انداز پر ہوئی تھی، جس میں نمازی فوجی کا حوالدار کے عہدے پر فائز ہونا محال تھا اور جس میں ایک نمازی کو عام فوجی تصور کرکے دور دراز کے علاقوں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ سفر بہت طویل ہے اور اس میں آنے والی رکاوٹوں (اور دشوار گزار گھاٹیوں) کو عبور کرنا ضروری ہے تاکہ سرزمین اسلام بلکہ پوری دنیا میں شریعت مطہرہ کا عملی نفاذ مسلمانوں کے لیے ممکن ہوسکے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ ہو کر رہنا ہے۔

(۶) اکثریت کی مذمت

چھٹا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جمہوری نظام حکومت میں اکثریت معتبر ہوتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت کی ہے اور اسے ہمیشہ باطل پر قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے:

﴿ وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ﴾

"دنیا میں رہنے والوں کی اکثریت کا اگر تو کہنا مانے گا تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھکا دے گی"۔

اور اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیت امت مسلمہ کی امت کفر سے نسبت کے اعتبار سے ہے کیونکہ امت مسلمہ بہ نسبت کافروں کے انتہائی کم تعداد میں رہی ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"تم دوسرے لوگوں (کافروں) کے مقابلے میں اس طرح ہو جیسے بیل کی سیاہ رنگ کی کھال میں ایک سفید بال"

رہا اہل اسلام کا باہم اجتماع تو وہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی بنا پر معصوم ہوتا ہے کہ "میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی"۔ لہٰذا اکثریت بہ نسبت اقلیت کے حق کے اپنے ساتھ ہونے کے زیادہ لائق ہے اور اقلیت کے ساتھ حق کا پایا جانا شاذ و نادر ہے،

کیا آپ نہیں سمجھتے کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگر کسی رائے پر متفق ہوں تو وہ ایک دو صحابیوں کی رائے سے زیادہ قوی ہو گی!! اور ایسا شاذ و نادر رہی ہے کہ حق اقلیت کے ساتھ ہو اور یہ اصول ذہن نشین رہے کہ جو اکثریت زیر بحث موضوع میں مطلوب ہے وہ اہل خیر اور حق پرستوں کی اکثریت ہے نہ کہ مفسدین اور گمراہ لوگوں کی!

پھر ایک ایسی حقیقت ہے جس میں شک و شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں کہ مسلمان عوام کی اکثریت خیر و بھلائی پسند کرتی ہے، اپنے اندر اللہ کی شریعت کا عملی نفاذ چاہتی ہے، حق کی حمایت کرتی ہے اور ایسی صورت میں جبکہ اسے آزادانہ ووٹنگ کا حق دیا جائے تو وہ اسلام کے متبادل کی تمنا نہیں کرتی ہے۔ اسی لئے اسلامی ممالک میں مجرم پیشہ لوگ عوام الناس کی مرضی میں جعل سازی اور غلط بیانی کرتے ہیں، ان کے ووٹ روک لیتے ہیں، انتخابات میں فریب دہی کرتے اور دین پسند جمہور کو اپنی منشاء کے مطابق ارکان اسمبلی چننے سے بہر طور روکتے ہیں۔ ایسے مفتی حضرات جو اہل خیر کو پارلیمانی انتخابات میں شمولیت سے روکتے ہیں وہ دراصل ان جعل سازی کرنے والوں کے لیے سب سے بڑی خدمت سرانجام دیتے ہیں جو لوگوں کی گردنوں پر اس دعوے کی بنا پر مسلط ہو جاتے ہیں کہ وہ عوام کی مرضی کو عملاً نافذ کرتے ہیں جبکہ فی الحقیقت وہ ایک گمراہ اقلیت کے نمائندہ ہوتے ہیں۔

(۷) فتنۂ دنیا

ساتویں دلیل کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انتظامی ذمہ داریوں اور رکنیت پارلیمنٹ دونوں میں فتنہ و آزمائش ہے، کیونکہ دنیوی زیب و زینت کے دلکش مناظر عہدے دار اور رکن اسمبلی کو شکار کر لیتے ہیں۔ دنیا اسے احکامات الٰہی سے غافل کر دیتی ہے اور اقتدار اسے دھوکے میں رکھتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ کہا، اس کے مطابق خرابی ان عہدوں یا رکنیت میں نہیں بلکہ خود اشخاص میں ہوتی ہے۔ (عام آدمی کو چھوڑیئے) بہت سارے علماء دین بھی تو دین برائے دنیا فروخت

کر دیتے ہیں، حکمرانوں اور عام لوگوں کی مرضی کے مطابق فتوے دیتے ہیں، عوام کو راضی رکھنے اور اپنے عہدے محفوظ کرنے کے لیے حق چھپاتے ہیں۔ سو یہ کہنا بجا ہوگا کہ خرابی دینی منصب اور خود ریاست میں نہیں بلکہ وہ دلوں اور بری تربیت میں ہے۔

یہ بات بھی مخفی نہیں کہ بہت سارے مسلمان داعی سیاسی تجربہ گاہ میں داخل ہوئے تو حکام کے دل و دماغ پر چھا گئے، انہیں محض اللہ کی رضا کے لیے نصیحت کی اور اسلامی جماعتوں کی بنیاد رکھی اور اس ساری جدوجہد میں وہ انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ اور اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر مجاہدانہ کردار ادا کرتے رہے بلکہ مومن حق کی شان ہی یہ ہے کہ وہ کسی بھی میدان میں حصول رضائے الٰہی کے لیے جب کوئی عمل کرتا ہے تو اس سے وہ طاقت و ہمت، اپنے دین کے لیے اخلاص و وفا اور اللہ کی حدود پر محافظت میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔[٢٦]

ہم آپ کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی ایک بات دوبارہ یاد دلاتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

"لہٰذا دین اور تقرب الٰہی کا ذریعہ تصور کر کے امارت کا قبول کر لینا واجب ہے کیونکہ امارت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنا، اللہ کے قریب کرنے والی چیزوں میں سے ایک ہے"۔[٢٧]

چنانچہ اسی حسن نیت کے ساتھ جس نے کوئی ذمہ داری قبول کی وہ تو کامیاب ہو گیا، لیکن جس نے حصول دنیا میں لالچ اور نفسانی خواہش کی پیروی کی، اس نے امارت کا حق ادا نہ کیا اور اس میں خائن ٹھہرا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے"۔

اور ارشاد باری ہے: "جن لوگوں نے ہمارے راستے میں جہاد کیا ہم ان کی اپنے سیدھے راستوں کی طرف ضرور راہنمائی کریں گے"۔

اس لئے جو لوگ عام عہدوں یا وزارتوں یا رکنیت پارلیمنٹ سے بگڑ جاتے (اور راہ حق سے ہٹ جاتے) ہیں ان کی خرابی کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ ذمہ داریاں سنبھالنا علی الاطلاق درست نہیں۔ اس حقیقت کو دوسرے انداز میں یوں سمجھئے کہ بہت سارے لوگ اگر مال و دولت کی وجہ سے بگڑ جائیں تو اس کو تحریم طلب مال پر دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح بہت سارے علماء اگر دینی علم اور لوگوں کی طرف سے اپنی تعظیم کے سبب راہ حق چھوڑ دیں تو ان کا یہ کردار طلب علم شرعی کی حرمت پر دلیل نہیں بن سکتا اور عین اسی طرح اگر کسی کو اس کے منصب نے بگاڑ دیا ہو تو اس لیے کہ خود اس میں خرابی قبول کرنے کی اہلیت موجود تھی نہ کہ خود منصب ہی باطل ٹھہرا۔ منصب تو عبادت الٰہی کا بہترین وسیلہ ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ امام عادل ان سات افراد میں سے سرفہرست ہے جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں جگہ دیں گے جب اس کے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا!!

(۸) رکنیت پارلیمنٹ بدعت ہے

آٹھواں اور آخری اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کوئی پارلیمنٹ نہیں تھی۔کوئی انتخابات نہیں ہوتے تھے لہٰذا مروجہ سیاسی نظام بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔

ہم اس کا جواب دو نکات میں دیتے ہیں:

اولاً: یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیاسی عمل کی اس کے تمام اچھے مفاہیم و مطالب کے ساتھ ترویج کی۔ایک جماعت تشکیل دی اور ایسے عقیدے کی طرف دعوت دی جس نے اس وقت کے تمام عقائد کو شکست دے دی اور اقتدار کا مالک صرف امت مسلمہ کو بنانے اور ہر اس رکاوٹ کو لازماً ہٹانے بلکہ یکسر ختم کر دینے کی طرف پکارا جو اسلام کے دعوتی میدان میں پیش آسکتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے حکومت و اقتدار کے تمام کام سرانجام دیئے۔مثلاً مختلف علاقوں پر گورنر مقرر کئے، چھوٹے بڑے لشکر اور دستے روانہ فرمائے، مختلف جہات میں اپنے نمائندے بھیجے، اسلام کی پہلی مملکت میں حدود الٰہی قائم کیں، اسے بہرطور منظم کیا اور غیر لوگوں سے معاہدے طے کر کے اس کا دفاع مضبوط بنایا۔یہ تو اس وقت کی بات ہے جب اسلام اور مسلمانوں کو قوت حاصل ہو چکی تھی اور جب وہ کمزور تھے تو تب بھی آپ ﷺ نے نصرت و حمایت طلب کی حتی کہ کافروں کی امداد کو بھی رد نہیں کیا۔سراً و جہراً دعوت الی اللہ کا کام کرتے رہے۔کافروں سے اپنی دشمنی کا واضح اعلان بھی فرمایا، انہیں قتل کی دھمکیاں بھی دیں اور اس بات کو کھلم کھلا بیان کیا کہ ان کا دین تمام ادیان سابقہ و موجودہ سے بہتر ہے اور عنقریب وہ قیصر و کسریٰ کے خزانے فتح کر لیں گے اور پھر انہی کی امت تمام امتوں میں طاقتور اور سب سے بڑی بادشاہت کی مالک ہو گی------ اس سب کو آج کل عرف عام میں "سیاسی کارناموں" کا نام دیا جا سکتا ہے خواہ لوگ اس کو "سیاست" کا نام دیں یا کوئی اور، یہ سارا کچھ یقینی طور پر، دعوت الی اللہ کا مزاج، قرآن مجید کا طریقۂ کار اور رسول اللہ ﷺ کی سنت طیبہ ہے۔(لہٰذا) صرف دینی علم کے سیکھنے سکھانے پر اکتفاء کرنے والے لوگ جان لیں کہ انہوں نے دعوت الی اللہ میں تو رسول اللہ ﷺ کا راستہ اختیار کیا ہے لیکن ان کی کماحقہ مکمل اور سچی پیروی نہ کی بلکہ وہ دین اسلام کے ایک جزو (تعلیم و تعلم) میں مصروف ہو کر رہ گئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام پر مشتمل ایک ایسی جماعت تشکیل دی جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں مرنے اور دین اسلام کی نصرت کے لیے جہاد کرنے کا عہد کیا اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ ﷺ نے اس جماعت کو باہم جوڑ کر رکھا، اسے دین کا علم سکھایا اور اپنے سامنے اس کی تربیت کی۔ چنانچہ یہی جماعت امت مسلمہ کے لیے ہراول دستہ اور اسلامی مملکت کے لیے بنیاد بنی۔ہم اگر چاہیں تو

رسول اللہ ﷺ کی اس پہلی جماعت کو حزب اللہ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے دور میں جہاں تک ہو سکا، فلاحی ادارے بھی قائم کیے اور اپنی اس جماعت کے ذریعے اپنے سامنے آنے والے ہر گروہ کو خواہ وہ یہود و نصاریٰ سے ہو یا عرب قبائل سے نیست و نابود کیا اور دنیا سے اس وقت رخصت ہوئے جب پورے جزیرۂ عرب پر اسلام کا جھنڈا لہراتا ہوا نظر آیا اور امت مسلمہ (وقت کی دو عالمی طاقتوں) روم و فارس کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کھڑی تھی بلکہ خود آپ ﷺ نے روم کے خلاف ۹ھ میں پیش قدمی کی اور مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان ایسی جنگ ہوئی جس میں رومیوں نے بزدلی کا مظاہرہ کیا" (۴۸)

اپنے اس سابقہ بیان کی بنا پر میں یہ کہنا پسند کرتا ہوں کہ سرکاری عہدوں کی ذمہ داریاں قبول کرنا اور اس قانون ساز اسمبلی کا رکن بننا جس میں دیندار امربالمعروف و نہی عن المنکر اور ممکنہ حد تک شر کو کم کرنے کا فریضہ سرانجام دے سکے، ان دعوتی کاموں کے مفہوم میں شامل ہے جن کی کئی انواع واقسام پر رسول اللہ ﷺ نے سالہا سال عمل کیا اور انہی کاموں پر لوگ آج کل "سیاسی عمل" کا نام بولتے ہیں۔ جبکہ بعض عام لوگ ایسے سیاسی عمل کو حرام قرار دینے لگے ہیں۔

ثانیاً: کئی ایسے نئے کام رونما ہو چکے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کے سلسلے میں حق تک پہنچنے اور زمین میں اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اجتہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ فتنۂ ارتداد کے خلاف رسول ﷺ کے عہد میں جنگیں نہیں ہوئیں کیونکہ اس وقت ایسے لوگ موجود نہ تھے جو نمازیں پڑھتے اور زکاۃ نہ دیتے ہوں (مگر خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف باوجود بعض صحابۂ کرام کی ابتداء مخالفت کے جہاد کیا، اسی طرح باغیوں سے آپ ﷺ کے زمانے میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی لیکن علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے خارجیوں کو باغی تصور کر کے ان سے جنگ کی اور واقعات جمل و صفین بھی انہی کے دور میں ہوئے (سو ان نئے پیش آمدہ واقعات کے سلسلے میں صحابۂ کرام نے اجتہاد کیا)۔ دورِ حاضر میں---- جس طرح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں مسلمانوں کا اقتدار یا کافروں کے پیروں تلے چلا گیا ہے یا اگر مسلمانوں کے پاس ہے تو بایں صورت ہے کہ ان میں کافروں کے کافرانہ جمہوری قوانین رائج العمل ہے، یہ وہ آزمائش ہے جس میں امت مسلمہ اس وقت بالفعل مبتلا ہو چکی ہے اور اس کا حل یقیناً وہی ہے جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

سو اگر شرعی مصلحت موجودہ قانون ساز اسمبلیوں کی رکنیت کا تقاضا کرتی ہو تاکہ برائی کو حتی الامکان کم کیا جا سکے اور جتنے اسلامی قوانین کسی بھی شکل میں موجود ہیں ان کی حفاظت کی جا سکے تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے صرف خیر ہی خیر رہ جائے اور اسلامی خلافت راشدہ قائم ہو جائے تو کیا اسے مزید شر و فساد کے لیے چھوڑ دیا جائے!! اور اسلامی ممالک کو فاسقوں اور کافروں کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ من مانی قانون

سازی کر سکیں اور امت مسلمہ کا جتنا دین باقی ہے، اسے جڑ سے اکھیڑ دیں!!

خاتمہ

میں اس بحث کا اختتام اپنی کتاب "المسلمون والعمل السیاسی" میں سے اپنے ان کلمات کے ساتھ کرتا ہوں:

"اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آج کل دین کے دشمنوں کی ایک ہی سوچ ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں اور بالخصوص داعیان اسلام اور سیاسی عمل کے درمیان فاصلہ پیدا کیا جائے، وہ بعض اوقات کہتے ہیں:

"تمہیں سیاست سے کیا لگے!"

اور کبھی کہتے ہیں: "دعوت و جہاد کے عمل کو سیاسی بنانا درست نہیں"

اور یوں بھی کہتے ہیں: "تم دعوت الی اللہ کا کام دنیوی و سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت کرتے ہو"۔

اس طرح کی ناموزوں و بے فائدہ باتیں کر کے وہ درحقیقت یہ چاہتے ہیں کہ داعیان اسلام مسلمانوں کے معاملات سے قطع تعلق کر لیں اور زمین میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے عملی تگ و دو سے باز آجائیں تاکہ میدان ان کے لیے خالی ہو جائے اور وہ من مانے انداز میں فساد پھیلا سکیں۔ مسلمانوں پر جو قانون چاہیں نافذ کر دیں، کلمہ دین کو پست اور کلمۂ کفر و باطل کو بلند کر سکیں اور داعیان اسلام اور ان کی اس جد و جہد کے درمیان حائل ہو جائیں جو وہ اپنی امت کی عزت و آبرو اور اپنے دین کی کرامت کے لیے نیز اپنے پروردگار کا پیغام پہنچانے اور لوگوں کو اپنے خالق و مالک کے سامنے جھکانے کے لیے کر رہے ہیں۔

دشمنان اسلام کی ان بے سروپا باتوں سے بعض داعی دھوکہ کھا سکتے اور پھر یہ موقف بھی اختیار کر سکتے ہیں کہ سیاست شرعیہ سے دور رہنا ہی ان کے دلوں (جذبۂ ایمانی) کے لیے زیادہ محفوظ راستہ ہے اور اس سے وہ اپنے رب تعالیٰ اور دین کے لیے زیادہ اخلاق کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔ یا یہ نقطۂ نظر اپنا سکتے ہیں کہ سیاست دعوت الی اللہ سے غافل کر دیتی ہے کیونکہ دعوت ان کے گمان کے مطابق صرف تصنیف و تالیف تک محدود ہے۔ یوں اسلامی ممالک میں سیاسی میدان جاہل افواج، لیڈر شپ کے پجاریوں، خبیث باطنی فرقوں اور امت مسلمہ کے دشمنوں کی لوٹ مار کا مرکز بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام معاملات کی لگام اپنے ہاتھ میں تھام لیتے ہیں اور زمین میں ظلم و فساد پھیلاتے ہیں۔ اللہ کی زمین کو (اپنا) مال اور اللہ کے بندوں کو (اپنے) غلام تصور کر لیتے ہیں۔ پھر عزتیں پامال کرتے ہیں، اموال پر قبضہ جمانا مباح سمجھ لیتے ہیں اور خود پیدا کردہ لوگوں کی مخدوش حالت کو اسلام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی شریعت طاہرہ کو کافرانہ نظام میں بدل ڈالتے ہیں۔

اس ساری صورتحال میں داعیان اسلام غفلت کی نیند سوئے رہتے ہیں، تمناؤں اور آرزوؤں سے اپنے دل بہلاتے رہتے ہیں- نوافل کی ادائیگی میں مشغول ہو کر فرائض ضائع کرتے رہتے ہیں- اپنی اس حالت کے ذریعے وہ دین اور زندگی کے درمیان، دین اور حکومت کے درمیان، دین اور عدل کے درمیان، دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے درمیان اور دین اور جہاد فی سبیل اللہ کے درمیان فاصلے پیدا کرتے ہیں- اسی سے وہ کافروں کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں، دشمنان دین کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں مدد دیتے اور لوگوں کی قیادت مجرموں، دہشت گردوں اور فسادیوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں- کیا یہ حکمت عملی کبیرہ گناہوں میں سے نہیں....؟؟[٢٩]

١- Regionalmaps/Charts)

2- Colonizeres)

٣- اس کتاب کا اردو ترجمہ کرنا بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہے، انشاء اللہ وھو ولی التوفیق

٤- **چاروں پالیسیوں کا خلاصہ**: موجودہ دساتیر و قوانین کی جو شکل و صورت ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے انتظامیہ اور مقننہ میں کسی ذمہ داری کو قبول کرنے کے متعلق چار نظریات پائے جاتے ہیں-

(i) یہ کفر و ارتداد ہے اور اس قسم کے دساتیر پر عمل کرنے والی حکومتوں کو طاقت سے معزول کرنا واجب ہے، نیز حکمرانوں اور ان کے ماتحت دیگر عہدے داروں کو قتل کرنا مباح ہے-

(ii) جائز ہے کیونکہ موجودہ جمہوری نظام اور اسلامی شورائی نظام میں کوئی فرق نہیں ہے، نیز اگر اسلامی احکامات سے وقتی طور پر دستبردار ہونا پڑے تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کیونکہ موجودہ صورت حال کو جواز کا رنگ دے کر اسے قابل کاروائی بنانے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں-

(iii) دین میں ابتداع اور منہج سلف صالحین سے انحراف ہے، لہٰذا کلی طور پر اس صورت حال سے علیحدگی اختیار کرلی جائے اور الگ، تھلگ رہ کر تعمیر نسل کا فریضہ سرانجام دیا جائے-

(iv) چند شرائط ضروریہ کے دائرے میں رہتے ہوئے جائز اور بعض مخصوص حالات میں واجب ہے، نیز اسلام کے ہر حکم کو اس کے اصل مقام پر رکھنا ضروری ہے- (مترجم)

٥- یعنی وہ قومیں جو یہود و نصاریٰ کی دینی حکومتوں کے ماتحت تھیں، انہیں وہ راس نہ آئیں اور انہوں نے انہیں اس دعویٰ سے مسترد کردیا کہ یہود و نصاریٰ دین کے بوجھ صحیح طور پر اٹھانے سے قاصر رہے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی حکومتیں ظلم و جبر اور ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ انجام کو پہنچ گئیں-

٦- دیکھئے --- فتاویٰ شیخ الاسلام (٢٨ / ٣٩٠-٣٩٧)

٧- مجموع الفتاویٰ (٢٠ / ٥٦-٥٧)

۸۔ سنت نبویہ سے دلیل اس طرح بنتی ہے کہ کفار میں رہتے ہوئے کسی عہدے کا سنبھالنا اگر ناجائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ نجاشی کی تعریف نہ کرتے اور ان کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھاتے، آپ ﷺ کا اس پر سکوت اس قصے کو تقریری حدیث کی حیثیت دیتا ہے جو کہ آپ ﷺ کی قولی و فعلی احادیث کی طرح قابل حجت ہے۔ (مترجم)

۹۔ البدایہ والنہایہ (۲ / ٦٧)

۱۰۔ الفتاویٰ (۲۰ / ۵۵)

۱۱۔ الفتاویٰ (۲۰ / ۵۷)

۱۲۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کسی ذمہ دار کو چننے اور امانت دار اور لائق ملازم کی بھرتی کے لیے حاکم وقت پر دباؤ ڈالنے کا عوامی دور تھا۔

۱۳۔ کاش وہ لوگ شیخ الاسلام کے اس فرمان پر مطلع ہو جائیں جو موجودہ حکومتوں کے زیر سایہ سرکاری عہدے قبول کرنے والوں کو کافر یا گمراہ قرار دیتے ہیں!!

۱۴۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیخ الاسلام" کے زمانے کے بادشاہوں کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ لوگوں کے اموال سے اپنے لیے فنڈز مخصوص کر لیتے تھے جو ان کے لیے قطعاً حلال نہیں تھے۔

۱۵۔ شیخ الاسلام کا یہ قیاس بالکل درست ہے کیونکہ مال یتیم پر اگر محصولات وغیرہ عائد کر دیئے جائیں اور سرپرست کے پاس انہیں ادا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو اس کے مد نظر اس کے لیے یہ قطعاً جائز نہیں کہ وہ اس یتیم کی سرپرستی چھوڑ دے اور اس کے مالی معاملات کو نہ سنبھالے، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ یہ نگرانی اس پر لازم ہوتی ہو۔

۱٦۔ تجارت وغیرہ پر لگائے جانے والے یہ لگان حرام ہیں کیونکہ یہ باطلانہ طریقے سے مال حاصل کرنے کی قبیل سے ہیں۔

۱۷۔ واہ! شیخ الاسلام نے کتنی اچھی دلیل دی ہے کہ اگر اہم پوسٹوں کو (ظالموں کے لیے) چھوڑ دیا جائے تو بہت بڑی خرابی پیدا ہو سکتی ہے!!

۱۸۔ ابن تیمیہ" کی اس دلیل اور مثال پر غور کیجئے اور اسے ہماری موجودہ صورت حال پر منطبق کیجئے، آپ کو محسوس ہو گا کہ چھوٹی خرابی کے ارتکاب کے عدم جواز کا جو شخص فتویٰ دیتا ہے۔ وہ دراصل مسلمانوں کو بہت بڑی خرابی کے دہانے میں ٹھونسنا چاہتا ہے۔ ابن تیمیہ" کا یہ کہنا بھی کیا خوب ہے کہ اس طرح کا مشورہ کوئی عقلمند نہیں دے سکتا، ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کل کئی گروہ اس کا باقاعدہ فتویٰ دیتے ہیں اور اپنے آپ کو سب سے بڑا عقلمند اور دانا تصور کرتے ہیں!!

۱۹۔ الفتاویٰ (۳۰/۳۵٦-۳٦۰)

۲۰- اور جس طرح ابتدائے نبوت میں رسول اللہ ﷺ کا دفاع اللہ تعالیٰ نے ان کے چچا ابو طالب اور قبیلہ بنو ہاشم کے ذریعے کیا۔ (مترجم)

۲۱- تفسیر عبدالرحمٰن بن ناصر سعدی (۲۸۹۱/۲)

۲۲- شیخ محمد الامین شنقیطی بطور قاضی: یہاں ہم اپنے استاذ رحمہ اللہ کے عہدۂ قضا کو بھی بطور دلیل ذکر کر سکتے ہیں۔ موصوف مدینہ منورہ کی طرف ہجرت سے قبل اپنے شہر "شنقیط" (موریطانیہ) میں بطور قاضی (Judge) کام کرتے رہے، کتاب "الرحلۃ الی مکہ" (ص ۲۲) میں شیخ کے متعلق یوں ذکر آیا ہے:

ملک میں ان کی خدمات

آپ کی خدمات آپ کے ہم پایہ و ہم شان علماء کی خدمات کی طرح ہی تھیں مثلاً درس، فتویٰ وغیرہ لیکن آپ قضا اور اس میں ذہانت و فطانت کے اعتبار سے خاصے مشہور ہوئے کیونکہ باوجودیکہ ملک کا حکمران فرانسیسی تھا، ہم وطنوں کو ان پر حد درجہ اعتماد تھا۔ وہ دور دور سے آپ سے فیصلے کروانے کے لیے آپ کے پاس پہنچتے تھے یا آپ خود جہاں بھی جاتے وہاں لوگوں کا آپ کے پاس ہجوم رہتا۔

قضا میں آپ کا طریقہ

فریقین جب آپ کے پاس آتے تھے تو ان دونوں سے آپ سب سے پہلے یہ لکھوا لیتے تھے کہ اگر وہ دونوں (واقعتاً) ان سے فیصلہ کروانا چاہتے ہیں تو جو فیصلہ وہ کریں گے انہیں وہ منظور کرنا ہو گا۔ پھر مدعی اپنا دعویٰ لکھتا اور دعوے کے نیچے مدعا علیہ کا جواب لکھا جاتا، بعد ازاں خود شیخ رحمہ اللہ۔ دعویٰ، جواب دعویٰ اور فیصلہ تحریر کرتے اور ان دونوں سے کہتے کہ اب تم علماء یا حکام میں سے جس کے پاس جانا چاہو جا سکتے ہو۔ رہے علماء تو وہ شیخ کے ہر فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے تھے اور حکام آپ کے فیصلے فوراً نافذ کر دیتے تھے۔ آپ ماسوائے قتل جان اور باقی حدود کے ہر معاملے میں فیصلے صادر فرماتے تھے اور قتل کے مقدموں کے لیے مخصوص جج منٹ ہوتی تھی۔

مقدمۂ قتل کا فیصلہ

ملک کا فرانسیسی حکمران مکمل قانونی چارہ گری اور وسیع پیمانے پر مقدمے کی پیروی کے بعد قصاص کا فیصلہ کرتا تھا، مقدمے کی اچھی طرح چھان بین کرتے، اپیل نمٹانے اور فیصلہ صادر کرنے کے بعد وہ اسے ملک کے جید علماء میں سے دو کے سامنے برائے تصدیق پیش کرتا جنہیں وہ "خونوں کی کمیٹی" کا نام دیا کرتا تھا۔ شیخ رحمہ اللہ۔ بھی اس کمیٹی کے ارکان میں سے ایک تھے۔ سو آپ اپنے ملک سے اس وقت نکلے جب قدر و منزلت کے عظیم الشان مقام پر فائز تھے، ملک کی شان و شوکت کی علامت سمجھے جاتے تھے اور اہل

وطن خواہ حکام ہوں یا محکوم دونوں کے ہاں قابل اعتماد تھے"۔اھ

۲۳- مجلّہ "الاصالۃ" (شمارہ نمبر ۴ ص ۲۰)

۲۴- ماھر بکری (الہجرۃ ص ۱۰)، کتاب الغلو فی الدین" / عبدالرحمن اللویحق (ص ۵۲۵) سے

۲۵- شکری مصطفیٰ (الخلافۃ ۶ / ۱۳) اور اسی سے عبدالرحمن اللویحق اپنی کتاب "الغلو فی الدین" (ص ۵۲۶) میں۔

۲۶- تفصیلات ہماری کتاب "المسلمون والعمل السیاسی" میں پڑھیے۔

۲۷- الفتاوی (۲۸ / ۲۹۰)

۲۸- المسلمون والعمل السیاسی (ص ۴۲-۴۳)

۲۹- المسلمون والعمل السیاسی (ص ۶۲-۶۳)